منتخب کشمیری افسانے
(اردو ترجمہ)
مصرہ مریم

منتخب کشمیری افسانے

(اردو ترجمہ)

مصرہ مریم

کمپیوٹر سٹی، راج باغ، سرینگر، کشمیر

کتاب	منتخب کشمیری افسانے
مصنفہ	مصرہ مریم
تعداد	ایک ہزار
تاریخ	دسمبر ۲۰۰۴ء
کمپوزنگ	عفت شفیع
سرورق	مسعود عالم
قیمت	۲۰۰ روپے
مطبع	رفیق پرنٹنگ پریس، سرینگر

کتاب ملنے کے پتے:

☆ کمپیوٹر سٹی، راج باغ، سرینگر

☆ کتاب گھر، لال چوک، سرینگر

☆ ماڈرن پبلشنگ ہاوس، ۹ گولا مارکٹ، دریا گنج، دہلی

☆ گلشن پبلیشرز، گاؤ کدل، سرینگر

انتساب

نورچشمی مسعود عالم

کے نام

مصرہ مریم

مندرجات

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

غالب

حرفِ اوّل

اردو کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان کے ادب سے بھی ایک قاری کی حیثیت سے میری وابستگی رہی ہے۔ خاص طور سے میں دونوں زبانوں کے افسانوی ادب کا مطالعہ کرتی رہی، جہاں تک کشمیری افسانے کا تعلق ہے یہ اردو اور باقی ملکی زبانوں کے افسانوں کے مقابلے میں کم عمر ہے اور اسکی تعداد بھی کم ہے۔ فنی اور تخلیقی اعتبار سے اس میں کمیاں بھی بہت ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پچھلے پچاس پچپن برسوں میں کشمیری زبان میں جو افسانے لکھے گئے ان میں کئی افسانے فکر وفن کے امتزاج کا عمدہ نمونہ ہیں، اور وہ ملکی سطح پر دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے افسانوں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح کشمیری میں بھی ابتدا میں لوک کتھائیں، دلیلیں اور داستانیں لکھنے کی روایت رہی ہے۔ یہ تاریخی، مذہبی، اساطیری، ثقافتی اور رومانوی کتھاوں اور دلیلوں کا ایک وسیع خزانہ ہے جس

کے خالق کشمیری الاصل ادیب ہیں ۔ چونکہ ابتدائی دور میں کشمیری زبان اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی کہ اس میں کچھ لکھا جاتا اور چھاپ خانوں کا وجود بھی نہیں تھا ،اس لئے یہ دلیلیں اور کتھائیں سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی گئیں ۔ کشمیری زبان وادب کے مورخ اور محقق کہتے ہیں کہ گیارویں صدی میں ایک کشمیری برہمن سوم دیو نے ''کتھا سرت ساگر'' کے نام سے ایک کتاب سنسکرت زبان میں لکھی جس میں لاتعداد کتھائیں اور دلیلیں جمع ہیں ۔ کچھ مورخوں کی یہ بھی رائے ہے کہ اس سے بہت پہلے ایک کشمیری ادیب گناڈین نے پشاچی زبان میں کتھاؤں اور دلیلوں پر مشتمل ایک کتاب ''برہت کتھا'' کے نام سے لکھی تھی اور سوم دیو نے ''کتھا سرت ساگر'' لکھتے وقت اس سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ کشمیری افسانہ نگار امر مالموہی نے ''کتھا سرت ساگر'' کا سنسکرت سے کشمیری زبان میں ترجمہ کیا ہے اور ریاستی کلچرل اکاڈمی نے اسکو ۱۹۹۴ میں شائع کیا ہے ۔ کتھا سرت ساگر کے بارے میں امر مالموہی لکھتے ہیں :

''سنسکرت زبان میں لکھا گیا یہ کتھاؤں کا سمندر یعنی ''کتھا سرت ساگر'' دنیا کی اولین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے ۔ اس کا مصنف یا ترتیب کار ایک کشمیری برہمن تھا جس کا نام سوم دیو تھا''

(کتھا سرت ساگر صفحہ ۳)

بارھویں تیرہویں صدی میں بھٹ اوتار نے ''بانا سر کتھا'' کے نام سے کتھاؤں اور دلیلوں کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کی زبان کے متعلق ڈاکٹر رتن لال شانت اپنی تاریخی اور تحقیقی کتاب ''نثرچ کتاب'' میں اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ پرانی کشمیری زبان ''بانا سر کتھا'' یا'' مہانے پرکاش'' (مہانے پرکاش کی شاعری)، جن کا زمانہ بارھویں تیرھویں صدی ہے، کی کشمیری ہے اور جو ایک سو سال بعد للہ دید اور شیخ نورالدین کی کشمیری (زبان) ہے''

(نثرچ کتاب۔ صفحہ ۱۵)

آخر کار انیسویں صدی میں سماجی اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر کشمیری لوک کتھاؤں اور دلیلوں کو جمع کرنے اور کتابی صورت میں چھاپنے کا بیڑا کچھ محققوں نے اٹھایا جن میں یورپین محقق پیش پیش تھے۔ ایک انگریز نیٹسن نوولز نے ۱۸۸۴ میں Folk Tales of Kashmir شائع کی اور آرل سٹاین نے کشمیری لوک دلیلیں Hatims Tales کے نام سے جمع کیں اور گریرسن نے ۱۹۲۳ میں لندن سے اسکو شائع کیا۔ یہ دلیلیں اور داستانیں آرل سٹاین نے ایک کشمیری داستان گو حاتم تیلی سے سن لی تھیں۔ کلہن پنڈت نے ۵۰۔۱۱۴۸ میں راج ترنگی لکھی ہے۔ اس میں راجوں اور مہاراجوں کے کارنامے اور تاریخی واقعات درج

ہیں ۔کئی واقعات کو افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے ،اس لئے اسکی افسانوی اوراساطیری حیثیت بھی مسلّم ہے۔اس کا کشمیری زبان میں ترجمہ موتی لال ساقی نے کیا ہے۔

کشمیری زبان میں نثر کی ابتدا پر ''کاشرادبک تواریخ'' میں اسطرح روشنی ڈالی گئی ہے:۔

''گیارھویں صدی میں سوم دیو نے ہزاروں دلیلوں کوایک کتاب میں یک جا کیا ہے جس کا نام ''کتھا سرت ساگر'' ہے کشمیر میں سب ایک دوسرے کودلیلیں سنایا کرتے تھےاور دلیلیں سنانے والوں کا ایک پیشہ ورطبقہ بھی تھا جن کا دلیلیں سنانے کا اپنا اپنا انداز اوراسلوب تھا۔عام طور سے ان کی نثر مقفع ہوتی تھی اور بیچ بیچ میں شعر بھی جوڑے جاتے تھے (جو گائے جاتے تھے)، سرآرل سٹاین نے کچھ لوک دلیلیں اصل روپ میں جمع کیں اور''حاتم نہ کتھ'' ان کا نام رکھااور۱۹۲۳میں گریرسن نے انگریزی میں اس کولندن میں شائع کیا۔اس طرح افسانوی نثر کی ابتدا ہوئی''

(کاشرادبک تواریخ صفحہ ۲۸۲ ، ناجی منور، شفی شوق)

ابتدا ہی سے کشمیری فن کاروں نے اپنے محسوسات و جذبات، خواب، مسائل تصوف ، تاریخی واقعات ،لوگوں کا رہن سہن اور زندگی سے حاصل کئے تجربات کا سیدھے سادھے انداز میں ان دلیلوں اور کتھاؤں میں بیان کیا ہے۔یہ لوک ادب کشمیری قوم کی سیاسی ،تہذیبی اورتمدنی زندگی کی

بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ کشمیر میں برفانی راتوں میں دلیلیں اور داستانیں سننے اور سنانے کی روایت ابھی پچاس ساٹھ سال پہلے تک موجود تھی۔

کہانیاں کہنے اور سننے کی ایک مستحکم روایت موجود ہونے کے باوجود کشمیری زبان میں افسانہ بہت بعد میں لکھا گیا۔ شاعری تو باقاعدہ طور پر چودھویں صدی سے لکھی جاتی تھی لیکن افسانہ اپنی اصلی صورت اور ہیئت کے ساتھ اس وقت رواج پا گیا جب کہ بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں اردو میں ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی۔ پریم چند کے افسانے پہلے ہی کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے تھے اور اس کے زیر اثر اسی کے رنگ میں کشمیری ادیبوں نے بھی اردو میں افسانے لکھے۔ پریم ناتھ پردیسی ۱۹۳۲ سے ہی کشمیر کے سیاسی اور سماجی مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے تھے۔

تقسیم ملک کے ساتھ ہی ریاست میں قومی کلچرل کانگرس وجود میں آئی تھی اور اس سے وابستہ نوجوان ادیب و شاعر اشتراکی نقط نظر اور انقلابی سوچ کے حامی تھے اور اردو میں لکھتے تھے۔ اس کی ادبی مجلسوں میں شاعری کے ساتھ ساتھ افسانے بھی پڑھے جاتے تھے۔ اور ان پر بحث ہوتی تھی۔ افسانوں کے موضوعات کے علاوہ فنی خوبیوں اور خامیوں پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی۔

اسی ماحول سے تحریک پا کر سوم ناتھ زتشی نے پہلا کشمیری افسانہ

''ییلہ پھول گاش'' (جب پو پھٹی) لکھا جو ۲۵ فروری ۱۹۵۰ کو قومی کلچرل کانگرس کی ایک نشست میں پڑھا گیا اور اپریل ۱۹۵۰ میں کونگ پوش میں شائع ہوا، ''کونگ پوش'' کے اسی شمارے میں مشہور کشمیری شاعر دینا ناتھ نادم کا کشمیری زبان میں لکھا گیا افسانہ ''جوابی کارڈ'' بھی چھپ گیا۔ اس لئے بعد میں اختلاف رائے نے جنم لیا کہ پہلا کشمیری افسانہ کس نے لکھا، سوم ناتھ زتشی نے یا دینا ناتھ نادم نے؟ اس اختلاف رائے کا خاتمہ امین کامل نے کیا اور صاف طور پر واضح کیا کہ پہلا کشمیری افسانہ سوم ناتھ زتشی کا ''ییلہ پھول گاش'' ہی ہے۔ یہ دونوں افسانے ''ییلہ پھول گاش'' اور ''جوابی کارڈ'' پرانی دلیلوں اور داستانوں سے الگ اور ہٹ کر ہیں ان میں اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات، غریبی اور طبقاتی اونچ نیچ کو روزمرہ زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانے فنی اعتبار سے کمزور ہیں، ان میں انقلابی جوش وخروش ہے اور یہ وقتی پروپگنڈا کا تاثر ابھارتے ہیں۔ تاہم ان افسانوں کو کشمیری افسانے کی تاریخ میں سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔

سوم ناتھ زتشی اور دینا ناتھ نادم کی تقلید میں چند اور قلمکاروں نے کشمیری زبان میں افسانے لکھنے کی طرف توجہ کی، جو اس وقت تک اردو میں لکھتے تھے۔ ان میں ارجن دیو مجبور، عزیز ہارون، نور محمد روشن، تاج بیگم رینزو اور حبیب کامراں قابل ذکر ہیں۔ اس دور کے اکثر قلمکار شاعر اور ڈرامہ نگار تھے۔ اس لئے وہ کشمیری افسانوی ادب میں کوئی خاطر خواہ اور

قابل ذکر اضافہ نہ کر سکے۔ اس دور میں انقلابیت پسندی کے تحت مقصدی افسانے لکھے گئے۔ ۱۹۴۷ کے خونین اور المناک واقعات اور اس کے بعد کے اثرات ان افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے حالم وقت کی غلامی اور ظلم و ستم، جاگیرداروں اور سود خواروں کے لوٹ کھسوٹ کے خلاف کشمیری عوام میں احتجاج کا ردِ عمل پیدا ہو رہا تھا۔ سماجی اونچ نیچ غریبی، افلاس اور جہالت کا احساس بڑھ رہا تھا اس لئے اس دور کے افسانوں میں ان ہی واقعات و حالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ افسانے بھی فنی اور تکنیکی نزاکتوں اور لوازم سے بہت حد تک عاری ہیں۔ لیکن ان کی اہمیت یہ ہے کہ یہ کشمیری افسانے کے اولیں نمونے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ۱۹۵۵ تک آتے آتے کشمیری افسانہ نے خاصی پختگی حاصل کر لی اور کئی قد آور افسانہ نگار سامنے آئے۔ ان میں اختر محی الدین، صوفی غلام محمد، علی محمد لون، امین کامل، غلام نبی بابا، شام لال سادھو، اوتار کرشن رہبر، امیش کول، ہری کرشن کول جیسے پختہ کار فنکاروں نے مستقل اور باضابطہ طور پر کشمیری میں افسانے لکھنے شروع کئے، حالانکہ یہ افسانہ نگار بھی اس وقت تک اردو میں لکھتے تھے۔ انہوں نے فنی اور تکنیکی لوازم کو برت کر کشمیری افسانے کو صحیح سمت عطا کی اور کشمیری زبان کو چند لازوال افسانے دیئے۔ اس لئے یہ دور کشمیری افسانے کا باثروت دور مانا جاتا ہے۔ یہ افسانہ نگار بھی ترقی پسند تحریک کے ساتھ نظریاتی وابستگی کی بنا پر

سماجی حقیقت نگاری سے کام لے کر اپنے افسانوں میں کشمیر کی سیاسی، سماجی، ثقافتی زندگی اور کشمیری ماحول کے مختلف پہلوؤں کی فنی لوازم کے ساتھ عکس بندی کرتے رہے، وہ کردار اور واقعات حقیقی زندگی سے چن لیتے ہیں، ان کے زیادہ تر افسانے کرداری افسانے ہیں، یعنی افسانے کے واقعات کردار کے گرد گھومتے ہیں۔ انہوں نے خالص کشمیری اور محاوراتی زبان کا استعمال کیا ہے، جو اس وقت بولی اور لکھی جاتی تھی۔ اختر محی الدین کا افسانوی مجموعہ ''ست سنگر'' صوفی غلام محمد کے افسانے ''ژنہ ژور'' (کوئلہ چور) اور ''مال دید'' امین کامل کے ''کوکر جنگ'' (مرغوں کی لڑائی) اور ''پھاٹک''، ہری کرشن کول کا ''تاپھ'' (دھوپ) کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

۱۹۶۰ کے بعد اس کارواں میں کئی اور افسانہ نگار شامل ہوتے گئے، بنسی نردوش، ہردے کول بھارتی، غلام رسول سنتوش، رتن لال شانت، ڈاکٹر شنکر رینہ، فاروق مسعودی، امر مالموہی، گلشن مجید، بشیر اختر، سید رسول پونپر اور انیس ہمدانی نے بدلتے حالات میں افسانہ نگاری کے فنی ضابطوں اور اصولوں کو اپنے افسانوں میں برتنے کی سعی کی۔ ان کے فوراً بعد نئی نسل کے نوجوان افسانہ نگار مثلاً ناصر منصور، مشتاق مہدی، شمس الدین شمیم، رتن لال جوہر، آفاق عزیز اور محفوظہ جان بھی قدم بہ قدم چلنے لگے۔

۷۰-۱۹۶۰ کے بعد افسانہ نگاروں نے جدیدیت کے زیر اثر علامتی، تخیلی اور تجریدی افسانے بھی لکھے۔ یعنی اب کشمیری افسانہ نگار بھی

خارجیت سے داخلیت کی طرف آ گئے۔ نہ صرف نئی نسل کے افسانہ نگاروں نے بلکہ روایتی انداز میں لکھنے والے کہنہ مشق افسانہ نگاروں نے بھی علامتی اور تجریدی افسانوں کے تجربے کئے۔ سوم ناتھ زتشی کا ''چھک چھٹک چھٹک'' اختر محی الدین کا ''ژی چھک ژی چھک'' (تم ہی ہو تم ہی ہو) اور ''ژس'' (خجالت) علی محمد لون کا ''شنی'' اور ''آدم حوا تہ ابلیس''، امر مالموہی کا ''آدم خور''، گلشن مجید کا ''سُہ'' (وہ) ہردے کول بھارتی کا ''ہمزاد''، تجریدی اور علامتی افسانوں کی مثال ہیں۔

آج کے افسانہ نگاروں کو آج کے نئے پیچیدہ مسائل اور غیر معمولی صورت حال کا سامنا ہے عصری آگہی سے ان کے فکر و نظر کے جہات کھل گئے ہیں، وہ انسان کے ذاتی درد و کرب، زندگی کی پیچیدہ حقیقتوں، نفسیاتی اور فکری پہلوؤں، آج کی دوڑتی بھاگتی زندگی کے تضاد، کشمکش، موت، بیماریوں، زوال عمر، نیکی، بدی، عشق، رومان یعنی مجموعی طور پر زندگی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو راست حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ اساطیری، تجریدی، داستانوی اور طنزیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۸۹ء کے بعد کے خونچکاں واقعات کو بھی افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

لیکن آج کشمیری افسانہ موضوعی، فنی اور تخلیقی اعتبار سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے ہوئے بھی منزل سے دور نظر آتا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ نئی نسل کے باصلاحیت قلمکار بلکہ چند بزرگ افسانہ نگار بھی کسب زر کے لئے یا

حصول شہرت کے لئے ٹیلیویژن سیریل لکھنے کی طرف راغب ہو گئے ہیں۔اس لئے اب کشمیری زبان میں جاندار اور تخلیقی افسانوں اور ناولوں کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کشمیری زبان وادب کی ترقی کرنے ، پھیلنے، قاری تک پہنچنے کے ذرائع بہت ہی محدود ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں کشمیری زبان میں اس وقت کوئی اخبار نہیں چھپتا ہے، صرف چند رسالے ہیں ان میں سے بھی اکثر سرکاری اداروں سے نکلتے ہیں اور ان کی تعداد محدود ہونے کی وجہ سے وہ عام قاری تک نہیں پہنچتے ہیں۔''شیرازہِ'' اور ''سون ادب'' (ریاستی کلچرل اکاڈمی) ''پراگاش'' اور ''آلو'' (محکمہ اطلاعات) اور کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ کشمیری کا سالانہ میگزین ''انہار'' تو چھپتے ہیں مگر قارئین تک مشکل سے ہی پہنچتے ہیں۔اسی طرح کالجوں کے میگزینوں میں ایک حصہ کشمیری کا بھی ہوتا ہے جس میں طالب علموں کی کاوشوں کو جگہ دی جاتی ہے۔

غیر سرکاری طور پر بھی چند ایک رسالے کشمیری زبان میں چھپتے ہیں۔شاہد بڈگامی سہ ماہی ''ہرمکھ'' بڈگام سے، شہزادہ رفیق ''ثقافت'' شوپیان سے، حکیم منظور ''خبر و نظر'' سرینگر سے نکالتے ہیں اور مراز کلچرل سنگم بھی ''مراز'' نام سے ایک رسالہ چھاپتے ہیں۔ان میں کشمیری ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔پہلے بھی وقتاً فوقتاً عوامی اور سرکاری سطح پر اخبار اور رسالے نکالنے کی کوششیں کی گئیں لیکن وہ جلدی ہی بند ہو گئے۔ایک ہفتہ

وار اخبار کشمیر کے نامور شاعر مہجور نے ۱۹۳۹ میں ''گاش'' کے نام سے جاری کیا تھا جو ۱۹۴۲ کے بعد ہی بند ہو گیا۔ ''ولر کہ ملر'' کے نام سے ایک سہ ماہی کتابی سلسلہ کا اجراء پروفیسر محی الدین حاجنی نے ۱۹۷۲ میں حلقہ ادب سونہ وار سے کیا تھا، کئی سال چلنے کے بعد یہ بند ہو گیا، ''ادیب'' غلام نبی حلیم اور سوہن لال کول نے ۷۴۔۱۹۷۳ میں جاری کیا تھا، یہ بھی دو تین سال کے بعد ہی بند ہو گیا۔ کئی برس پہلے غلام نبی خیال نے اخبار ''وطن'' نکالا تھا، زیادہ دیر تک یہ بھی نہ چل سکا۔ منیب الرحمٰن اور رفیق راز نے ''قاف'' نام سے رسالہ نکالا تھا، وہ جلدی ہی بند ہو گیا، نامور کشمیری شاعر امین کامل نے ''نیب'' نام سے ایک رسالے کا اجراء کیا تھا، وہ چند برس چلنے کے بعد بند ہو گیا۔ اخبار ''دیہات سدھار'' اور ''اخبار چمن'' جاری ہونے کے بعد ہی بند ہو گئے، ''پرتو'' دائرہ ادب دلنہ کی طرف سے ۱۹۸۰ میں نشاط انصاری نے جاری کیا تھا تین سال بعد بند ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کشمیری زبان میں چھپنے والے ان رسالوں اور اخباروں کو زندہ رکھنے کے لئے کشمیر میں ہی پڑھنے والے موجود نہیں ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی میں کشمیری زبان وادب کی تدریس کے لئے شعبہ کشمیری قائم کیا گیا ہے اور کالجوں میں بھی اس کو ایک مضمون کے طور پر پڑھاتے ہیں لیکن ابھی تک یہ زبان سکولوں میں پڑھائی نہیں جاتی ہے اور اگر کہیں ہے تو اِس کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

کشمیری زبان وتہذیب کی پس ماندگی کے لئے یہاں کے تاریخی اور جغرافیائی حالات وواقعات بھی ذمہ دار ہیں۔ابتدا سے ہی کشمیر پر باہر سے آئے حملہ آواروں نے حکمرانی کی اور اپنے ساتھ لائی ہوئی زبان وتہذیب کو یہاں کے لوگوں پر مسلط کرتے رہے اور یہاں کی زبان وکلچر کو دبانے کی سازشیں کرتے رہے۔تقریباً ہر حکمران نے اپنی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا اور سر پرستی کی اور کشمیری زبان کو آج تک سرکاری سر پرستی حاصل نہ ہوسکی۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی حوصلہ افزا صورت حال نہیں ہے۔ادیب اور شاعر لکھتے اس لئے ہیں کہ کوئی انکی نگارشات کو پڑھے۔جب وہ نہ ہوتو لکھاری لکھے گا کیوں؟ یہی وجہ ہے کہ کئی کشمیری ادیب وشاعر اردو یا ہندی میں لکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کشمیر سے باہر گئے ہوئے ادیب کشمیری کو دیو ناگری رسم الخط میں لکھنے لگے ہیں اس لئے کہ ان کی نئی نسل کشمیری رسم الخط سے بالکل نابلد ہے۔ہاں یہ بات باعث اطمینان ہے کہ ریاستی کلچرل اکاڈمی نے کشمیری زبان کے فروغ کے لئے بہت کام کیا ہے۔کشمیری زبان وادب کی ابتدا اور ارتقا پر جو تحقیقی کام اس ادارے کے ذریعے اب تک ہوا ہے وہ قابل ستائش ہے۔اس سلسلے میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ کشمیری کے کام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔لیکن جب تک پڑھنے والوں کا دائرہ وسیع نہ کیا جائے اس وقت تک ساری کوششیں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہونگی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کشمیری زبان کو باضابطہ طور پر ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے سکولوں میں رائج کیا جائے۔ کشمیری زبان میں اخبار اور رسالے باقاعدگی کے ساتھ چھپ جائیں اور انکو جاری رکھنے کے لئے سرکاری سرپرستی حاصل ہو اور سرکاری امداد ملتی رہے جب تک انکی بنیاد مستحکم نہ ہو جائے۔ اخبار اور رسالے ہی فنکاروں کی تخلیقات کو قاری تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ کسی زبان کی ترقی اور فروغ کا اندازہ اسی سے لگایا جاتا ہے کہ اس میں کتنے اخبار، رسالے اور کتابیں شائع ہوتی ہیں۔

کشمیری ادب کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ کشمیری ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی تحریریں کشمیر سے باہر ان لوگوں تک پہنچ جائیں جو کشمیری زبان سے ناواقف ہیں اور کشمیری زبان میں لکھے گئے شعر و ادب سے لاعلم ہیں۔

۱۹۹۸ میں ہم نے اردو میں ''جہات'' کا اجراء کیا اس کا ایک مقصد یہ تھا کہ کشمیری زبان میں لکھی گئی منظومات اور افسانوں کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ اس کام کو انجام دینے کی ذمہ داری میں نے قبول کرلی، اور 'جہات' کے اولین شمارے سے ہی میں نے کشمیری کے معیاری اور منتخب افسانے اور منظومات کا ترجمہ شروع کیا۔ اس کام میں روز بہ روز میری دلچسپی بڑھتی گئی اور میں نے تقریباً چالیس افسانوں کو اردو میں منتقل کردیا۔ ان میں سے کئی افسانے اور منظومات 'جہات' کے صفحات کی زینت بن گئے۔ میرے لئے

اطمینان کی بات یہ ہے کہ اردو دنیا میں ان تراجم کی پزیرائی ہوئی جیسا کہ جہات میں مطبوعہ قارئین کے مکتوبات سے ظاہر ہے۔اس سے میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے اعتماد کے ساتھ اس پر کام جاری رکھا اور آج آپ کے سامنے ان تراجم کا ایک مجموعہ پیش کر رہی ہوں۔ اللہ نے چاہا تو میں ترجموں کا دوسرا مجموعہ بھی عنقریب ہی مرتب کرونگی۔ کشمیری افسانوں کو اردو جامہ پہنانے کی ان کاوشوں سے میرا مدعا صرف یہ ہے کہ اردو حلقوں میں کشمیری افسانوں کو متعارف کیا جائے۔ بعض کشمیری افسانوں کا پہلے بھی اردو میں ترجمہ ہوا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ زیادہ تر افسانے کے موضوع کو اردو میں ترجمہ کرنے سے سروکار رکھتے ہیں جبکہ مترجم کو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ افسانہ نگار نے کہاں تک فنی اور لسانی لوازم کا خیال رکھا ہے اور کیا ترجمہ مکمل طور پر ان کا احاطہ کرتا ہے یا نہیں۔

میں نے ترجمہ کرتے ہوئے حتی الامکان اصل متن کے قریب رہنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ترجمہ کرتے وقت افسانہ ہو یا نظم، اصل متن کی لسانی صورت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ہر زبان کا ادب اپنے مخصوص کلچر اور لسانیات کا زائیدہ ہوتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت ان مخصوص کلچرل عناصر کی بازیابی بھی ضروری ہے جن کے زیر اثر افسانے نے جنم لیا ہے۔ میری نظر ترجیحی طور پر ایک تو افسانہ نگاروں کے ان افسانوں پر رکی ہے جو Content کا اعلان نامہ نہیں بلکہ متکلم، مخاطب، واقعہ اور کردار

کے عمل اور ردعمل سے ایک تخیلی صورت حال کو پیش کرتے ہیں۔ اس سے افسانہ حقیقت نگاری کے سادہ اور بیانیہ (Narration) سے گریز کر کے ایک دلچسپ اور تہہ دار اکائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دوسرے ان افسانوں پر بھی میری نظر رکی جو کشمیری زندگی، ماحول، سیاسی اور سماجی صورت حال کی فنکارانہ عکاسی کرتے ہیں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ خود کئی کشمیری افسانہ نگاروں نے بھی میری اس کاوش کو پسند کیا ہے۔

میں اپنے رفیق حیات پروفیسر حامدی کاشمیری کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور ان کے ساتھ ترجمے کے آرٹ پر گفتگو کرنے کا موقع ملا اور میرا کام آسان ہوا۔ میں اپنے بیٹے مسعود عالم کی بھی شکرگزار ہوں، جس نے یہ کتاب چھاپنے کی پوری ذمہ داری اٹھائی ہے۔

بہر حال یہ مجموعہ آپکی نذر ہے۔ امید ہے اردو اور کشمیری زبانوں کے ماہرین میری اس کاوش کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔

مصرہ مریم

مسعود منزل
کوہ سبز
شالیمار، سرینگر

بلائے بے درماں

شام لال سادھو

﴾شام لال سادھو(۱۹۱۷ ملہ پورہ ,سرینگر) انگریزی کے پروفیسر تھے، انہوں نے کشمیری شعر وادب پر خاصا کام کیا ہے۔انہوں نے کشمیری لوک ادب پر انگریزی میں ایک کتاب Folk Tales From Kashmir لکھی ہے۔وہ کشمیری زبان میں افسانے لکھتے تھے۔انہوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں اوران کو''بیربل'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا ۔ہے۔سائنسی دریافتوں کے بارے میں بھی کشمیری زبان میں ایک کتاب''وژھ پرینگ''(اڑن کھٹولا) شائع کی ہے۔ان کے افسانوں کا مجموعہ''قصاص''بہت پہلے شائع ہوا ہے۔شام لال سادھو شروع سے ہی ترقی پسند نظرئے کے حامی تھے اوراسی نظرئے کے تحت سماجی حقیقت نگاری سے کام لے کر انہوں

نے کشمیری عوام کی زندگی کے مسائل، رہن سہن، غریبی، جہالت اور حکمرانوں کے مظالم کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ''بلائے بے درماں'' (ادرزٹ) اس کی ایک مثال ہے۔ وہ گہرے مشاہدے اور تخلیقی ذہانت سے کام لیتے ہیں۔
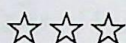
روز کی طرح آج بھی وہ چار دوست کھیل رہے تھے، رگھوناتھ، جیون سنگھ، غلام قادر اور تھامس گِل۔ وہاں ان کے علاوہ اور بھی ڈرائیور تھے لیکن ان میں اچھی برادری تھی اور یہ چار دوستی میں مشہور تھے، جب انہیں سینما جانا ہوتا تو اکھٹے جاتے، بچوں کے لئے کپڑے بنوانے ہوتے تو اکھٹے بنواتے۔ ان کے بارے میں سب کہتے تھے،

ہندو مسلم سکھ عیسائی
آپس میں ہیں بھائی بھائی

آج وہ مل کر تاش کھیل رہے تھے،

''حکم تُرپ ہے''

رگھوناتھ نے تاش بانٹ لیا اور غلام قادر نے تُرپ بنایا،

یہ سرکاری گیراجز میں ڈرائیور تھے، اس لئے آپس میں مل بیٹھنے کی فرصت کم ملتی تھی، کیونکہ مہاراجہ کے پاس بہت سے مہمان آیا کرتے تھے، ان میں راجہ مہاراجے، ولایت سے آئے ہوئے انگریز اور ہندوستان کے حاکم ہوتے تھے۔ وہ کشمیر کے چپے چپے کی سیر کیا کرتے تھے اور یہ ڈرائیور ان کے ساتھ رہتے تھے،

''حکم کی دُکی سر ہے'' گِل نے تالی بجائی۔ اسکا چہرہ سانولا تھا، کشمیری صاف نہیں بول سکتا تھا، اس لئے اس کی باتیں سن کر سب ہنستے تھے۔

''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی'' غلام قادر نے کہا'' جیتنا تو ہمیں کو ہے''۔

آسمان آئینے کی طرح صاف تھا اور دھوپ خوش گوار تھی۔ وہ چاروں سبزے پر بیٹھے تھے، بسنتی رنگ کی پگڑیاں باندھے اور خاکی رنگ کے کوٹ پہنے جن پر لگے پیتل کے بٹن چمک رہے تھے۔ یہ سب جوان تھے، گل عیسائی تھا وہ باہر سے آیا تھا، سردار جیون سنگھ ہمیشہ اپنی داڑھی فکسر سے باندھ کے رکھتا تھا، کہتا تھا'' یہ مجھے پٹیالہ کے مہاراجے نے سکھایا ہے''۔

غلام قادر کی آنکھیں نیلی تھیں۔ سب اس کو بلا کہکر چھیڑتے تھے، رگھوناتھ ہر روز مندر سے ہو کر آتا تھا، ٹیکہ لگا کے۔

تاش کی بازی ختم ہوگئی۔ غلام قادر ہار گیا۔ گل نے پر جوش لہجے میں کہا ''بلے، بولو حکم کی ڈکی نے کام کیا یا نہیں''۔

''ٹھہر گلو، جلد بازی نہ کر'' غلام قادر نے کہا،

وہ دوسری بازی کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں ایک اور ڈرائیور ملک محمد آ گیا اور ہانک لگائی۔

''ہندو مسلم سکھ عیسائی۔ آپس میں ہیں بھائی بھائی''

''ارے چپ رہو، اس وقت ہماری توجہ اپنے پہاڑی لہجے سے ہٹانے کی کوشش مت کرو'' جیون سنگھ نے کھیلتے ہوئے کہا،

''میری آواز کیوں تمہارے دل میں چبھ گئی'' اس نے کہا، ''چلو چھوڑو اب ڈیوٹی پر جانا ہے''۔

''ارے ابھی یہ نہ بتاؤ، پہلے یہ بازی ہو لینے دو'' التجا آمیز لہجے میں رگھوناتھ نے کہا۔

''اتنی فرصت کہاں ہے۔ جیون سنگھ کو تین بجے ٹنگمرگ پہنچنا ہے اور وہاں سے اس فرنگی کو لانا ہے جو واسرائے کے بیٹے کا دوست ہے۔ گل کو راجہ پتھاپورم کو لے کے پہلگام جانا ہے۔ اور غلام قادر کو صبح سویرے جرنیل کی بیوی کو لے کے راولپنڈی جانا ہے۔ اسکو کل شام کے سات بجے ہی وزیر آباد پہنچنا ہے''۔

سب ڈرائیور عموماً ڈیوٹی کا سن کر خوش ہو جاتے تھے۔ ایک تو ڈیوٹی دے کر

تنخواہ کے حقدار بن جاتے تھے، بیٹھے رہنا یا ڈیوٹی سے جی چرانا حرام کھانے کے برابر تھا، دوسرے ان کی ڈیوٹی راجوں، نوابوں اور بڑے آفیسروں کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ خوش ہو کر بخشیش دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کو ایک اور چسکا بھی تھا۔ ان کو سرینگر سے جموں یا راولپنڈی جانا ہوتا تھا۔ سو میل کا راستہ تھا اور یہ راستہ سنسان تھا۔ پندرہ بیس میل کے بعد دو چار دیہاتی مکان نظر آتے تھے۔ دائیں بائیں کوہ اور دریا تھے۔ گھنٹوں کے وقفے کے بعد کوئی ایک چوبیس سیٹوں والی لاری چلتی تھی۔ مسافر اس سفر میں تھک جاتے تھے۔ سرکاری موٹروں میں جو مہمان سفر کرتے تھے وہ عموماً شراب ساتھ رکھتے تھے، تھکاوٹ دور کرنے کے لئے اور ان کے ساتھ دل بہلائی کے لئے اور بھی سامان ہوتا تھا۔ ڈرائیوروں کے سامنے ان کی قلعی کھل جاتی تھی، جیسے حمام میں سب ننگے ہو جاتے ہیں۔ سفر سے واپسی کے بعد جب وہ ڈرائیور ملتے تھے تو ان مہمانوں کی غیبت کرنے میں انہیں بڑا مزہ آتا تھا۔

''ارے کیا بتاؤں کہ ان گنہگار آنکھوں نے کیا کیا دیکھا''

''معلوم ہے مہاراجہ نے کیا کیا جب مجھ سے کہا ''شوفر مر نیچے کرو''

''وہ شہزادی کیسی ہے کیا بتاؤں پرائیویٹ سیکرٹری کے ساتھ کہاں جاتی ہے''

غیبت کرنا اور سننا سب کو اچھا لگتا ہے، اپنے بھائیوں کے سامنے

اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے سے ان کی سفر کی ساری تکان دور ہو جاتی تھی۔ خیر تاش کی بازی ختم ہوگئی اور دونوں پارٹیاں تاش گننے میں لگ گئیں کہ کس نے کتنا جیتا۔ گننے کے بعد رگھوناتھ نے کہا ''تو یہ سات ہیں ٹھیک ہے نا''۔

غلام قادر کا ساتھی جیون سنگھ تھا، وہ ہار گئے۔ وہ ہارتے نہیں اگر غلام قادر غلطی نہ کرتا۔ جوں ہی اس نے ڈیوٹی کے بارے میں سنا وہ گھبرا گیا۔ جانے وہ کیوں ڈر گیا؟ اس کی گھبراہٹ کی خاص وجہ تھی جس سے سب ڈرائیور بھائی واقف تھے۔ اسکو جرنیل کی بیوی کے ساتھ راولپنڈی جانا تھا۔ جس کا شوہر مہاراجہ کا دوست تھا۔ آٹھ دس سال پہلے وہ کشمیر میں تھا اور اس وقت دلی میں فوج کا ایک بڑا آفیسر تھا۔ کبھی کبھی وہ دونوں میاں بیوی یہاں ساتھ آتے تھے ورنہ اسکی بیوی اکیلی آتی تھی۔ یہ سرکاری مہمان ہوتے تھے اور ہر طرح کی سہولت ان کو میسر ہوا کرتی تھی۔

خود جرنیل بہت اچھا تھا، ملازموں کی دلجوئی کرتا۔ جب شکار کھیل کر آتا تو وہاں سے جو کچھ لاتا، وہ مچھلی ہوتی یا تیتر یا شکاری ہنس، وہ سب ملازموں اور ساتھیوں میں بانٹ دیتا تھا۔ وہ انکو بخشیش بھی دیتا تھا، اور جہاں بھی کھانا کھانے جاتا وہاں ڈرائیور سمیت سبھی ملازموں کو بھی کھلاتا تھا۔ وہ جتنا خود اچھا تھا اتنی ہی بری اس کی بیوی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھی مچھلیوں کا شکار کرتی تھی لیکن ان کے ٹکڑوں تک کا حساب رکھتی تھی۔ کسی کی مجال نہیں

تھی کہ وہ اس کے لنگر میں جا کر چائے کی ایک پیالی پی لے۔ اگر ڈرائیور اس کے ساتھ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دیتا تو وہ کبھی بھی اس سے نہیں پوچھتی تھی کہ اس نے کچھ کھایا یا چائے پی یا بھوک تو نہیں لگی؟

سب اپنی عزت کا پاس کر کے خود اپنے کھانے پینے کا انتظام کرتے مگر اس خاتون میں اور بھی اوصاف تھے۔ جس کی وجہ سے سب ملازم اس سے ایسے ڈرتے تھے جیسے ڈائن سے۔ قدرت نے اسکو سروقد عطا کیا تھا، بڑی بڑی آنکھیں، ہلکے سنہرے بال، ترشی ہوئی ٹھڈی اور اس پر ایک تِل جس سے سینکڑوں عورتوں میں بھی الگ پہچانی جاتی تھی۔ عمر تقریباً پنتالیس سال، ویسے تو محفلوں میں خوش باش تھی اور ہنس مکھ، مگر جن ملازموں کو اس سے واسطہ پڑتا تھا وہ نالاں رہتے تھے۔ ''میرے سامنے اس کا نام نہ لو، معلوم نہیں شام تک کونسی افتاد پڑے گی''۔

ہوتا بھی وہی تھا۔ ایک بار بڈا سنگھ نے اسکو وزیر آباد سے سرینگر لایا، جو شریف اور تجربہ کار ڈرائیور تھا، وہ معطل ہوگیا، ایک دن امام دین کی اس کے ساتھ ڈیوٹی تھی تو اس کو جرمانہ ادا کرنا پڑا، حال ہی میں نندہ لال کی ایک سال کی ترقی بند ہوگئی، اس نے جرنیل کی بیوی کو راولپنڈی سے سرینگر لایا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ وہ ہمیشہ ان کے خلاف شکایت کرتی تھی۔ اور مہاراجہ کے لئے ان کو سزا دئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا تھا۔ اس کی شکایت کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی اس سے غفلت نہیں برتی جا سکتی تھی۔ لیکن ان

بیچاروں سے کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ آخر ہوا کیا اور تمہارے خلاف شکایت کیوں کی گئی۔

جرنیل کی بیوی میں ایک نقص بھی تھا، جو دور سے نظر نہیں آتا تھا۔ وہ یہ کہ وہ اونچا سنتی تھی یعنی بہری تھی۔ اس کے ساتھ بات اونچی آواز میں کرنی پڑتی تھی۔ یوں تو مطلب کی بات آہستہ بھی سنتی تھی، لیکن وہ بات جو اس کے مطلب کی نہیں ہوتی تھی، اسکو سمجھانے کے لئے نقارہ بجانا پڑتا تھا۔ گلے کی رگیں کھنچ جاتی تھیں۔ وہ سفر میں بہت بولتی تھی۔ اگر ڈرائیور کسی بات کا جواب دیتا تو وہ معلوم نہیں کیا سنتی تھی اور پھر اسکے خلاف شکایت کرتی تھی۔

ڈرائیور گاڑی آہستہ چلاتا تو کہتی ''تم نالائق ہو، سرینگر پہنچنے میں تین ماہ لگ جائیں گے''۔ اگر تیز چلتا تو کہتی ''شوفر، مرنا ہے کیا، جو اتنا تیز چلاتا ہے۔ نکما۔۔۔۔'' اور پھر اس پر برس پڑتی۔ ان کی بے عزتی کرنے کے بہانے تلاش کرتی رہتی۔ موڑ کاٹنے پر، ہارن بجانے پر، بات کرنے پر، وردی پہننے پر۔ ہر وقت بک بک کرتی رہتی اور گھنٹوں ان کا پیچھا نہ چھوڑتی۔ ڈر کے مارے وہ خاموش رہتے۔ لیکن اگر کسی وقت اس کی ڈانٹ برداشت سے باہر ہو جاتی تو وہ جواب دیتے، تو پھر اس کا پارہ چڑھ جاتا۔

مہاراجہ کے پاس شکایت کرتی اور مہاراجہ ان کو سزا دیتا۔ پھر کئی ماہ بعد معاف کر دیتا کیونکہ اس عورت سے غیر واقف نہیں تھا۔ اس وقت وہ تغافل نہیں کر سکتا، اس لئے کہ وہ ناراض ہو کر دلی میں واسرائے کے پاس

اس کے خلاف بھی شکایت کرتی۔

ڈرائیوروں نے اسکو (ادِر زئٹ) ''بلائے بے درماں'' نام دیا تھا۔ جس کے پیچھے پڑے گی اسکو آسانی کے ساتھ چھوڑے گی نہیں۔

آج غلام قادر کی باری تھی۔ اسکے ساتھی سوچنے لگے کہ اس کو کیسے بچایا جائے۔ جیون سنگھ نے مشورہ دیا ''اگر کچھ کہے گی تو تم ڈٹ کر جواب دینا اس بری عورت کو، سب ہنس دئے مگر فکر مند تھے کہ کہیں اس بچارے کی بھی شامت نہ آجائے۔

''نہیں بھائی غصہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، وہ خطرناک عورت ہے، سرکار بھی اس سے ڈرتی ہے۔ بظاہر اسکی عزت ہی کرنی پڑے گی، کہنا کچھ نہیں''۔ غلام قادر نے جواب دیا۔

''اگر ابھی جانے میں ایک دو دن ہوتے تو میں مشورہ دیتا کہ چھٹی لو اور بیمار بن جاؤ۔ مگر صبح سویرے ڈیوٹی پر جانا ہے۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ جاو پیر دستگیر کے حوالے''۔ رگھوناتھ نے کہا۔

''ہاں وہی مدد کرنے والا ہے'' غلام قادر نے جواب دیا۔

شام کو غلام قادر گھر پہنچ گیا تو اداس تھا، کھانا کھایا۔ لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ بیوی سے صرف اتنا کہا کہ صبح سویرے ہی راولپنڈی جانا ہے۔
''جاؤ اللہ کے حوالے۔ وہی حفاظت کرے گا اور صحیح سلامت واپس گھر لائے گا''۔ وہ دو تین گھنٹے سو کر اٹھا اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔ نماز ادا

کی، چائے پی لی اور پانچ بجے صبح گھر سے روانہ ہوا۔اس نے سوچ لیا تھا کہ اسکو کیا کرنا ہے۔اس کا باپ بچپن میں ہی مر گیا تھا۔اس کی ماں محنت کش تھی، اس کے چچا کو بھی انہیں پالنے اور پوسنے کا بوجھ اٹھانا پڑا تھا۔یوں تو وہ ملنسار تھا مگر مزاج کا تیز تھا۔کسی وقت اسقدر غصہ کرتا تھا کہ ان یتیموں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔اس وقت ماں سمجھاتی تھی کہ ''کچھ نہ کہنا، چپ رہنے میں ہی فائدہ ہے۔۔۔کچھ دیر بعد تمہارا چچا خود ہی آئے گا اور کہے گا، میرے بچو صدقے جاؤں، میں نے تم کو بہت تنگ کیا، میں چڑسی ہوں نا، مجھے معاف کرنا''۔غلام قادر نے اپنی جنتی ماں کی نصیحت کو یاد کیا، ''چپ رہنے میں ہی فائدہ ہے''۔

صبح سات بجے اس نے جرنیل کی بیوی کو ہوس بوٹ سے اٹھایا اور سفر پر روانہ ہو گئے۔چھتہ بل میں سڑک پر چلتے ہوئے گاڑی کے سامنے دو گدھے کھڑے ہو گئے۔غلام قادر نے ہارن بجایا مگر وہ ڈٹے رہے، مجبوراً اس نے ایک دم بریک لگائی اور ساتھ ہی گاڑی کو موڑ لیا، پھر کیا تھا۔جرنیل کی بیوی کا نازک جسم ذرا ہل گیا اور اسکا پارہ چڑھ گیا، زبان کھولی اور اس پر برس پڑی، لیکن قادر نے زبان کو دانتوں کے نیچے دبا کے رکھا تھا اور اپنی ماں کی نصیحت کو یاد کیا۔اور خاموش رہا۔آدھ گھنٹے میں وہ پٹن پہنچ گئے، ابھی سویرا تھا اس لئے سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ڈرائیور ہوشیار اور تجربہ کار تھا، لیکن ڈرتا تھا کہ اگر کوئی غلطی ہوئی تو بے عزتی ہوگی۔

جب وہ پٹن سے نکلا تو ایک موڑ کاٹنا تھا تو اس نے رفتار کم کر دی اور ہارن بجایا۔ بیگم جرنیل موقع کی تاک میں تھی، وہ چیخ پڑی، ''تم بڑے نکمے ہو، تم کو کوئی جانچ نہیں۔ اس وقت کونسا ٹریفک ہے، جو سلو چلتا ہے''

غلام قادر کا دل جل گیا اور جی میں آیا کہ سخت جواب دوں پھر اسکو خیال آیا کہ وہ بہری ہے۔ میں کچھ کہونگا تو یہ کچھ اور سنے گی، میں تو مر ہی جاونگا، اور پھر کچھ کہتے ہوے چیخنا بھی پڑے گا۔ یہ تو اسی طرح دن بھر میرا ناک میں دم کر دے گی یہ سوچکر اس کے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال آیا جیسے تاریکی میں چراغ کی روشنی۔ اس نے کانوں کو چھو کر اسے اشارے سے سمجھایا کہ میں کچھ نہیں سنتا۔

جرنیل کی بیوی نے غصے میں زمین کو لات ماری۔ دانت پیسے اور رگوں کو کھینچ کر چیخ ماری ''ڈیم'' (Damn!)۔ اس کی تصوراتی دنیا ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، وہ سمجھ گئی کہ وہ اس کو کچھ نہیں کہہ سکے گی یہ بھی اُسی جیسا ہے، آسانی کے ساتھ اسکی بات سن نہیں پائے گا۔ اس کے بعد اس نے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ اگر کوئی بات کی بھی وہ غلام قادر کو اچھی لگی۔ وہ بارہ مولہ سے آگے چناری پہنچ گئے۔ وہاں اسکو لنچ لینا تھا۔ اس نے غلام قادر کو بھی کھلایا اور راولپنڈی پہنچ کر اسکو بخشیش بھی دے دی جو اس نے آج تک کسی اور کو نہیں دی تھی۔

چُھک چھٹک چھٹک

سوم ناتھ زتشی

سوم ناتھ زتشی (۱۹۲۳-۱۹۹۴، رگھناتھ مندر، سرینگر) کوکشمیری زبان کا پہلا افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔انہوں نے ''یلہ پھول گاش'' (جب پو پھٹی) کے عنوان سے پہلا کشمیری افسانہ لکھا جوانہوں نے ۲۵ فروری ۱۹۵۰ کوقومی کلچرل کانگرس کی ایک ادبی نشست میں پڑھا۔اور جو اپریل ۱۹۵۰ میں ''کونگ پوش'' میں شائع ہوا یہ ایک مقصدی افسانہ ہے۔مصنف نے اس خیال کوافسانے کا موضوع بنایا ہے کہ آزادی ملنے کے بعدبھی کشمیرمیں طبقاتی اونچ نیچ اورغربت اپنی جگہ پرقائم ہے۔وہ بھی ترقی پسندرجحانات اورانقلابی جوش سے متاثر تھے اوراپنے افسانوں میں انہوں نے کشمیرمیں غریبی، مفلسی، سیاسی انتشار، جہالت،طبقاتی تضاد کوحقیقی روپ میں پیش کیا ہے۔سوم ناتھ زتشی ڈرامے بھی لکھتے تھے چندافسانے لکھکرڈرامہ نگاری کی طرف ہی متوجہ ہوگئے۔بیسویں

صدی کے ساتویں دہے کے بعد جب انہوں نے کشمیری میں
افسانے لکھے تو وہ ایک پختہ مشق افسانہ نگار کی حیثیت سے
سامنے آئے ''چُھک چھٹک چھٹک'' اسی دور کا لکھا افسانہ ہے
جس نے خاصی مقبولیت حاصل کرلی۔ یہ ان کے ابتدائی دور
کے افسانوں کی نعرہ بازی، پروپگنڈا اور وضاحت سے پاک
ایک اعلےٰ تخلیقی افسانہ ہے۔ اس کا پس منظر تقسیم ملک کے بعد کا
انسانی المیہ ہے۔

☆☆☆

اس وسیع اور عریض ریلوے سٹیشن پر سناٹا تھا کیونکہ کمروں پر تالے
لگے تھے، کوئی نیوی بلیو وردی والا وہاں موجود نہیں تھا اور نہ ہی کوئی لال
وردی والا قلی، لیکن مسافروں کی بھرمار تھی جیسے پورے ملک کے مسافر پہلی
بار سفر پر نکلے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی محسوس ہورہا تھا کہ سب کے ہونٹ
سلے ہوئے تھے۔ سفید گوٹی والا مسافر گہری نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہا
تھا۔ اسکی بیوی نے اسکے بائیں ہاتھ کو زور سے پکڑ رکھا تھا، ٹرین پلیٹ فارم
کے ساتھ لگی دروازے بند کر کے سوئی تھی۔ شام کے سائے پھیل رہے

تھے۔ کہیں سے بجلی کی روشنی نہیں آرہی تھی۔

گاڑی کے نکلنے کا وقت کب کا گزر چکا تھا۔لوگوں کے چہروں پر بے چینی، اضطراب اور خوف تھا، کب منزل پر پہنچ جائیں گے؟ انہوں نے چوری چھپے خاموشی کے ساتھ پلیٹ فارم پر گھومنے والے کچھ لوگوں سے ٹکٹ خرید لئے تھے اور ایک دوسرے کی طرف دز دیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ اطراف سے آئے ہوئے لوگ تھے، مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے۔

سفید گوٹی والا آدمی بجلی کے کنکریٹ کھمبے کے ساتھ ایستادہ تھا۔اس نے سنا'' کہتے ہیں اب ملک میں کہیں بھی کوئی وردی والا اور انجن ڈرائیور ہوگا نہ ہی کوئی گارڈ یا کنڈکٹر''۔۔۔

''کیا یہ اچھا ہوگا''؟

جواب آیا'' اچھا ہوا یا کچھ اور، گاڑی جلد نکل جاتی! سفر بہت لمبا ہے اور کٹھن''!

بھوک لگ گئی نہ کوئی مکان ہے اور نہ ہی خوانچے والا۔

''چپ ہو جاؤ، تمہیں بھوک لگنے میں دیر نہیں لگتی، تمہاری بھوک بھی ختم نہیں ہوتی''، کسی نے تیز تیز چلتے ہوئے بلند آواز میں کہا، شاید یہ کوئی نیا منتظم تھا۔

کنکریٹ کھمبے کے ساتھ ٹیک لگا کر سفید گوٹی والا آنکھیں جھکا کے چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بیوی نے اس کا ہاتھ زور سے پکڑے رکھا

تھا۔ وہ سکڑ سی گئی تھی۔ قریب ہی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ٹرنک پر بیٹھ کر ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب بیوی نے خاوند کی توجہ ڈرتے ڈرتے اس کی طرف مبذول کرائی تو وہ کھڑا ہو گیا اور آہستہ سے ان سے کہا۔ ''میں ہوں ۔۔۔ نہیں نہیں میں تھا ریلوے گارڈ، سٹیشن بند ہو گئے، وردی لے گئے، سب کچھ لے گئے۔''

''ہنھ'' سفید گوٹی والے نے جواب دیا۔

اچانک بہت سے ہٹے کٹے افراد دوڑتے دوڑتے پلیٹ فارم پر آ گئے، ہاتھوں میں ڈنمبیل تھے۔ ایک ایک فرد نے ایک ایک ڈبے کا دروازہ لیا، ہر ڈبے کا ایک ہی دروازہ تھا۔ ٹرین بہت لمبی تھی، اتنی لمبی ٹرین آج تک آنکھوں نے نہیں دیکھی تھی ایسا لگتا تھا کہ اس ٹرین کا پچھلا حصہ سندھیا سمے کے ساتھ جا ملا ہے۔

ریل کے اگلے ڈبے کا دروازہ ایک ڈنمبیل والے نے کھول دیا تو لوگ دھکا پیل کرتے ہوئے چڑھ گئے، مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے۔ لہنگا پہنے اور چونڈا نکالے بہت سی عورتیں تھیں جنہوں نے اپنے پہلو کے ساتھ بچے لٹکا کے رکھے تھے۔ قسم قسم کے لوگ، مگر جب سفید گوٹی والا اور اسکی بیوی اندر گئے، وہ ششدر کھڑے رہ گئے۔ نہ سیٹیں تھیں نہ برتھ، آدھی کھڑکیوں پر لکڑی کے تختے لگے تھے۔ اور آدھوں پر لوہے کے پتر۔ اندر بھیڑ کی وجہ سے لوگوں کے پسینے چھوٹ گئے۔ حبس دم سے بچوں کی آنکھیں ابل

پڑیں۔ بڑوں اور چھوٹوں کی زبانیں باہر نکل آئیں۔

جب ایک بڑے باتھ روم کا دروازہ کر کر کرتے کھل گیا، سارا ڈبہ سڑاند سے بھر گیا اس سے گیس اٹھا اور دھوئیں کی طرح پھیل گیا اور ریل کا ڈبہ بھی پھیلنے لگا، اسکی چوڑائی بڑھتی گئی، ڈبہ دگنا تگنا ہو گیا، لوگ کانپنے لگے چھت پر دو تین لالٹین لٹک گئے جیسے الادین کے چراغ پیدا ہوئے اب گوٹی والے کوڈ نمبیل والا کنڈکٹر صاف نظر آیا۔ وہ دروازے کے اندر سٹول پر بیٹھا تھا، موٹا تازہ آدمی، جیسے سائیکل پمپ سے ہوا بھر دی گئی ہو، پیٹ باہر کو نکلا ہوا، لمبی گھنی مونچھیں، سر پر جالی دار ٹوپی، لال بش شرٹ اور نیلے نائٹ کلاتھ کا دھاری دار پاجامہ، پاوں میں موٹا جوتا اور بش شرٹ کالر کے نیچے چک رومال۔ مونچھوں کو مروڑ کر، دیدے پھاڑ کے اس نے سر کے اشارے سے لوگوں کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ آدھے لوگ زنگ آلود ٹرنکوں پر اور آدھے گول لپیٹے بستروں پر ایک طرف کو بیٹھ گئے، کچھ پھٹی پرانی دریوں پر اور کچھ نیچے زمین پر۔ لہنگا والی عورتیں بیچ میں بیٹھ گئیں، سفید گوٹی والا اپنی بیوی کے ساتھ ایک طرف کو کھڑا رہ گیا۔

باہر کہیں سے پتلی سی آواز آئی ''ٹھنڈی ککڑی، ٹھنڈی ککڑی''

پیاسوں نے ککڑی خریدنے کے لئے اٹھنا چاہا لیکن ڈنمبیل والے نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ بیٹھے رہو۔ اس نے بارہ گرہ لمبا بازو دروازے سے باہر نکالا، جو لمبا ہوتا ہوا پلیٹ فارم پر دور تک گیا اور کوئی دس بارہ ٹوکریاں لپیٹ

کے ساتھ لائیں اور ڈبے کے لوگوں کی طرف ساری لکڑیاں پھینک دیں اور جس کو جو ملا سو ملا۔ گوٹی والے آدمی کو لگا کہ یہ لکڑیاں سبز فانوس کے ٹیوب ہیں جو ابھی چھینا جھپٹی کرنے والوں کے حلق میں پھٹ جایں گے، وہ خندہ بہ لب ہوا اور ڈمبیل والے کنڈکٹر نے نتھنے پھلا کے اس کی طرف دیکھا۔

گدھے کی زوردار ڈھانچوں کی آواز آئی اور گاڑی چل پڑی، جوں ہی گاڑی چلنے کی آواز کانوں میں پڑی تو مسافر لرز گئے۔ ایسی آواز ان کے کانوں نے کبھی سنی نہ تھی۔ شاید کوئی پہیہ پھٹ گیا تھا یا چکور کے بجائے چھیہ کونوں والا تھا اور پانی کی لہروں میں پھنسی بڑی کشتی کی طرح دائیں جانب جھک جاتا تھا۔

آہستہ آہستہ یہ آواز ماند پڑ گئی تو لگا کہ ریل گاڑی کے پنکھ نکل آئے اور اس نے ایک گِدھ کی طرح اڑنا شروع کیا۔ سفید گوٹی والے نے خندہ لب کے ساتھ خود سے کہا، ''کیا یہ گدھ ہم گوشت کے لتھڑوں کو واقعی پہاڑ کے پار منزل پر پہنچا دیگا، کیا یہ ہمیں پہاڑ کی چوٹی پر نہیں کھائے گا اور ہماری ہڈیوں کے پنجروں کو وہیں پر چھوڑ نہیں دے گا''؟

کنڈکٹر نے لہنگا والی عورتوں کو کھڑا ہونے کا اشارہ کیا، وہ کھڑی ہوگئیں۔ کنڈکٹر نے ناچ کر ان کو ہاتھوں سے دکھایا کہ ناچو، عورتوں نے شاید گھنگرو باندھے، نہیں انکے پاؤں میں گھنگرو بندھے ہی تھے اور انہوں نے کنڈکٹر کے ساتھ گول گول ناچنا شروع کیا مگر گھنگروں کی آواز کسی نے

نہیں سنی جس طرح سفید گوٹی والے اور اسکی بیوی کے سوا کسی کو سڑاند محسوس نہیں ہوتی ''یہ کنڈکٹر معلوم نہیں کس کس کو پاوں تلے کچل دے گا''، گوٹی والے کی بائیں جانب بیٹھے آدمی نے اسے زیرلب کہا۔

گوٹی والے نے ''ہونہہ'' کیا جیسے کچھ سوچ رہا تھا، تو کہا، ''پہیے کے نیچے جو آیا وہ مر گیا، یہ کنڈکٹر نہیں ہے، یہ اس گاڑی کا ایک پہیہ ہے جو گھوم رہا ہے۔''

آہستہ آہستہ ناچ رک گیا اور مسافر بھی بدحال ہو کر بیٹھے بیٹھے جھپکیاں لینے لگے۔ صرف کنڈکٹر آنکھیں کھولے ان تھکے ماندے مسافروں اور سفید گوٹی والے کی طرف ٹکٹکی لگا کے دیکھ رہا تھا، گوٹی والا ایک طرف کھڑا تھا، وہ بھی ناک پر رومال رکھکر اور کنڈکٹر کو بیچ بیچ میں چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ڈبے پر خاموشی کا راج تھا مگر کچھ دیر بعد ہی یہ خاموشی ٹوٹ گئی کہ گاڑی کے پہیوں نے پھر بے ہنگم شور کیا اور رک گئے۔

باہر سے وہی پتلی آواز آئی ''ٹھنڈی ککڑی، ٹھنڈی ککڑی'' گوٹی والے نے غصہ بھری نظروں سے کنڈکٹر کو دیکھا اور پوچھا۔

''یہ کونسا مذاق ہے؟ ہم کہاں ہیں؟

کنڈکٹر نے مسافروں کی طرف دیکھا، جو اندھی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور کُھسر پُھسر کر رہے تھے، اور کہا، ''یہ وہ ککڑی والا نہیں ہے، یہ دوسرے سٹیشن کا ہے۔ ہم نے ان کے حلق میں پلاسٹک کے

ٹیوب لگا دئے ہیں، اسی لئے سارے ککڑی بیچنے والوں کی ایک جیسی آواز نکلتی ہے۔

لوگوں کے چہروں پر رنگت آئی لیکن یہ رنگ پھر اڑ گیا جب گوٹی والے نے بہ آواز بلند کہا'' جھوٹ، سراسر جھوٹ، یہ وہی سٹیشن ہے جہاں سے ہم نکلے تھے۔''

اس نے بیوی کا بازو پکڑا، مسافروں پر حقارت بھری طنز آمیز نظر ڈالی اور دروازے کی طرف گیا۔ سامنے سے کنڈکٹر آیا، مگر اس نے اس کے پیٹ پر مُکا مارا اور بیوی سمیت پلیٹ فارم پر کود گیا، وہ منّہ کے بل گر گیا، کنڈکٹر بھی فوراً کود گیا، تم کہاں بھاگ جاؤ گے؟ وہ اس پر ڈنمبیل مارتا مگر اتنی دیر میں گاڑی نکل گئی، اس نے جلدی سے دروازے کے لوہے کے ڈنڈے کو پکڑا اور لٹک گیا۔

گوٹی والے نے اس کو لٹکتے دیکھا اور لیٹے لیٹے ہی بیوی سے کہا،'' وہ گرنے والا ہے۔''

گاڑی کا ایک پہیہ پھٹ گیا، گوٹی والا خود سے کہہ رہا تھا، چکر دھری پر گھومتا ہے، جیسے زمین محور پر گھومتی ہے۔ لیکن یہ کوئی سٹیڈیم نہیں جس کے گرد یہ گھوم رہی ہے کولہو کے بیل کی طرح، یا یہ گرداب ہے؟۔۔۔وہ بیوی کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ اٹھا اور سنسان رات کا جائزہ لینے لگا۔

پھاٹک

امین کامل

امین کامل (۱۹۲۴ کاپرن، کولگام) بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ شاعری اور افسانوں کے علاوہ وہ ڈرامے بھی لکھتے رہے۔ انہوں نے کشمیری زبان میں ایک ناول ''گٹہٕ منز گاش'' (تیرگیِ میں روشنی) بھی لکھا ہے۔ کشمیری میں صوفی شاعری پر انہوں نے قابل قدر تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے جو ''صوفی شاعری'' کے نام سے تین جلدوں میں منظر عام پر آچکا ہے۔ انہوں نے کشمیری میں ''نیب'' رسالہ بھی جاری کیا تھا جو چند سال بعد بند ہوگیا۔ انہوں نے کشمیری زبان وادب کو بڑھاوا دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

ان کا افسانوی مجموعہ ''کتھِ منز کتھ'' (بات میں سے بات) چھپا ہے'' کوکر جنگ'' (مرغوں کی جنگ)، ''ہردواو'' (خزان کی آندھی) اور پھاٹک نے ادبی حلقوں

میں پزیرائی حاصل کی ہے۔ امین کامل اپنے افسانوں میں کشمیری عوام کے مسائل جیسے جہالت، سماجی نابرابری، ان کا رہن سہن، حکمرانوں کا ظلم و جبر اور اس بدحال اور پس ماندہ قوم کی نفسیاتی پیچیدگیوں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ پچاس پچپن سال گزرنے کے بعد بھی ''پھاٹک'' افسانہ آج کے دور میں بھی معنویت رکھتا ہے۔

☆☆☆
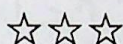
دوارکا ناتھ کے ساتھ میری پرانی جان پہچان ہے۔ میرے والد اور انکے درمیان دس سال تک برداری اور یاری تھی۔ یاری بھی وہ کہ ایک جان اور دو قالب، جب تک میرے والد زندہ تھے، دوارکا ناتھ پندرہ بیس دن بعد روز ملنے آتے تھے، خواہ وہ میلوں دور کسی جگہ تھانہ داری پر کیوں نہ تعینات ہوں۔ میرے والد کے ساتھ دوستی کی وجہ سے وہ میری عزت کرتے ہیں اور مجھے عزیز رکھتے ہیں، وہ تھانے کی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپاتے، چھوٹی چھوٹی باتوں کی نوعیت ہی کیا، وہ انتہائی راز کی باتیں بھی مجھ سے کہتے ہیں۔

پرسوں میں اپنے ذاتی کام سے انہیں ملنے گیا، کچھ دن پہلے شہر کے اندر سیاسی گڑ بڑ ہوگئی تھی، کچھ لوگوں نے دفعہ ۱۴۴ توڑ کر بازار میں جمع ہوکر حکومت کے خلاف مظاہرہ کیا تھا، باتوں باتوں میں میں نے دوارکا ناتھ سے کہا ''یہ صحیح ہے کہ مظاہرہ کرنے والوں کو گرفتار کرنا آپ کا فرض تھا مگر یہ کتنا گھور انیائے ہے کہ آپ لوگوں کے گھروں میں گھس جائیں اور بے گناہوں کو نکال کر تھانے میں بند کردیں، میں ایسے دس بیس افراد کو ذاتی طور جانتا ہوں جو ایسے بکھیڑوں میں کبھی پاوں ڈالتے ہی نہیں آخر اس طرح اندھا دھند لاٹھی چلانے سے کیا حاصل ہوتا ہے''

دوارکا ناتھ نے میری اس بات پر خندہ زیر لب کیا اور پھر جیب میں سے سگریٹ کیس نکالا، ایک سگریٹ خود لیا دوسرا مجھ کو دے کر کہنے لگا،''تو آپ کو اس سوال کا جواب چاہئے، ٹھیک ہے، سن لیجئے''۔

دوارکا ناتھ نے جو کچھ مجھ سے کہا، اس پر مجھے ایک بات یاد آئی، کم از کم چھبیس سال پرانی، ان دنوں کشمیر میں مہاراجہ ہری سنگھ کا راج تھا، اب اس راج کو ختم ہوئے سنتالیس دس ستاون ایک اٹھاون، پورے گیارہ سال ہوگئے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک دن میں صبح دس بجے کالج جارہا تھا، تو ایک جگہ میں نے دیکھا کہ پولیس والے کچھ گایوں کے گلے میں رسی ڈالے انہیں گھسیٹتے ہوئے لے جارہے تھے۔اوران پولیس والوں کے پیچھے پیچھے کچھ خواتین اور

ان کے چھوٹے بچے روتے اور سینہ پیٹتے ہوئے آ رہی تھیں۔

ایک پولیس والا ان خواتین سے کہہ رہا تھا، ''یا تو ہماری بات تمہاری سمجھ میں آتی ہی نہیں ہے یا تم اس میں کوئی دھوکا سمجھتی ہو''۔

''سنئے، ہم آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہیں۔'' خواتین ترحم خیز انداز میں کہہ رہی تھیں ''خدا کے لئے چھوڑ دیجئے۔ ان گایوں کو چھوڑ دیجئے، واری جائیں''۔

''پھر اپنی ہی ہانکتی ہو''۔ دوسرا پولیس والا غصے سے کہہ رہا تھا۔ ''شاید تم کو یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہم تم کو دس آنے دیں گے''۔ وہ دوسرے پولیس والے سے کہنے لگا'' ان کے ہاتھ میں دس آنے تھما دو تا کہ ان کے کلیجے کو ٹھنڈک ملے''۔

اس پولیس والے نے ان کو پیسے دینے چاہئے لیکن ان خواتین نے وہ نہیں لئے، وہ صرف انکی منت سماجت کر رہی تھیں اور قسمیں دیں رہی تھیں کہ ان کی گایوں کو چھوڑ دیں۔

میں حیران تھا کہ اگر یہ پولیس والے قانون کے مطابق ان گایوں کو آوارہ گھومنے پر پھاٹک میں لے جا رہے ہیں تو پھر یہ لے دے اور قسما قسمی کس لئے ہو رہی ہے؟ یہ پولیس والے ان کو کیوں پیسے دے رہیں ہیں؟ میں ان کے قریب گیا اور پوچھا'' سنئے یہ قصہ کیا ہے؟ آپ ان گایوں کو کہاں لے جا رہے ہیں؟''

''بھائی بات کچھ نہیں ہے، ایک پولیس والے نے جواب دیا، ہمیں یہ گائیں پھاٹک میں بند کرنی ہیں۔ہاں، ہم ان سے کہہ رہے ہے، ادھر سے ہم ان کو پھاٹک میں بھر دیں گے، ادھر سے تم انہیں واپس نکال لاؤ۔ان کو وہاں دس آنے تاوان دینے پڑیں گے، یہ ہم دے رہے ہیں، بات سیدھی سی ہے مگر ان مال زادیوں کی سمجھ میں نہیں آتی ہے، ذرا آپ ہی سمجھا دیجئے، لیجئے یہ رہے دس آنے آپ ہی ان کے حوالے کیجئے''۔

نہ میں نے پیسے لئے اور نہ ان خواتین کو سمجھایا، کیونکہ یہ مسئلہ خود میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔اس لئے کہ گائیں پھاٹک میں بند کئے جارہی ہیں، لیکن یہ پولیس والے اپنی جیب سے تاوان ادا کررہے ہیں، آخر کیوں؟ انہیں کیا پڑی ہے، اگر ان کی غریبی پر ترس آرہا ہے (کبھی ایسا ہوتا ہے) پھر ان گایوں کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے، میں نے ان سے کہا،'' آپ کا کہنا ٹھیک ہے مگر آپ بدلے میں ان کو یہ پیسے کیوں دے رہے ہیں؟''

''اجی کیا کہیں'' ایک پولیس والے نے اپنے چہرے کو دردناک بنا کر کہا'' کل مہاراج صاحب دہلی سے ہوائی جہاز میں یہاں آئے نا؟ آپ کو معلوم ہے، ہوائی اڈے سے گپکار شاہی محل تک راستہ بند کیا گیا تھا، جو ایسے موقعوں پر کیا جاتا ہے جبکہ مہاراج صاحب کو کہیں جانا ہوتا ہے، آپ کو معلوم ہی ہے پھر اس راہ پر مکھی کو بھی آنے کی اجازت نہیں ہوتی جب تک مہاراج صاحب وہاں سے گزر نہیں جاتے، کل اس سڑک کے دونوں طرف

سے پولیس کا زبردست پہرہ تھا، شامت اعمال، جس وقت مہاراج صاحب ریشم خانہ کی سیدھ میں سڑک پر پہنچ گئے، اسی وقت اچانک اسی گلی سے دو گائیں دوڑتی ہوئی نکلیں اور بغیر دیکھے بھالے سڑک پار کرنے لگیں۔ پولیس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کامیابی نہیں ہوئی لیکن مہاراج صاحب کو موٹر روکنا پڑی جب تک یہ گائیں ادھر اُدھر نہیں ہوئیں۔ انہوں نے اسی وقت ڈی آئی جی پولیس کو حکم دیا کہ ان سارے پولیس والوں کو معطل کردیا جائے جن کی وہاں ڈیوٹی تھی اور جو وہاں ڈیوٹی پر کاربند تھے، اس کے ساتھ ہی ڈی آئی جی پولیس نے حکم دیا کہ جہاں کہیں بھی آوارہ گائے ملے اس کو پھاٹک میں بند کردیا جائے، جو پولیس والا اس میں غفلت برتے گا وہ معطل ہوجائے گا، ہمارے بھی بیوی بچے ہیں، ہم کسی کے لئے اپنی روزی پر لات نہیں مار سکتے، ہمیں بھی اپنی ڈیوٹی پر کاربند رہنے کا ثبوت دینا ہے، ہمیں ادھر ادھر کہیں بھی کوئی آوارہ گائے نظر نہیں آئی جس کو ہم پھاٹک پر لے جاتے، لہذا ہم نے ان کے گاؤ خانوں سے یہ گائیں نکالیں ان کو محض پھاٹک میں بھرنے کے لئے۔ اب رہی یہ بات کہ ان کو دس آنے وہاں تاوان دینے پڑیں گے وہ ہم دیں گے، اس میں کون ساٹیڑھا پن ہے"۔

مجھے اس دن بھی ہنسی آئی اور پرسوں بھی جب دوارکا ناتھ نے میری بات کا ایسا ہی کوئی جواب دیا۔

شٔنیہ

علی محمد لون

❁علی محمد لون (۱۹۲۶۔۱۹۸۷ادر گجن، سرینگر) نے ۱۹۵۵ سے کشمیری زبان میں افسانے لکھنے شروع کیے۔ وہ ترقی پسند نظرئے کے قائل تھے اور ابتدا میں انہوں نے اسی نظرئے کے تحت چند افسانے لکھے ہیں جو زیادہ تر مقصدی نوعیت کے ہیں۔ چونکہ وہ ریڈیو میں ملازم تھے اس لئے ریدیو ڈرامے لکھنے کی طرف ہی متوجہ رہے۔۱۹۶۰ کے بعد بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر ان کے خیالات ونظریات میں بھی تبدیلی آئی اور انہوں نے چند اچھے تخلیقی افسانے لکھے، ان میں محض حقیقت بیانی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ تخیلی آمیزش بھی ہے۔ان میں انسان، انسانی رشتوں، انسان کی نفسیاتی اور حسیاتی الجھنوں کی مصوری کی گئی ہے۔ ''آدم حواتہ ابلیس'' اور ''شنی'' نئی آگہی کے تحت لکھے گئے تمثیلی اور تجریدی افسانے ہیں۔ان کا ایک ناول ''اسہ تہِ چھیہ انسان'' (ہم بھی انسان ہیں) بھی شائع ہوا ہے۔❁

وے کیوم بے انت، وسیع اور روز بروز پھیلتا ہوا وے کیوم!

یہ وے کیوم زمین سے باہر خلا میں نہیں بلکہ میرے دل اور دماغ میں پیدا ہوا ہے، وہ خلا جو کبھی بھی بھر نہیں پائے گا،

دن اور رات کا چکر

ایک بے معنی چیز

سحر ہوئی، روشنی پھیلی،

شام ہوئی اور رات آئی

دن گیا، رات بھی ختم ہوئی، لیکن اس سے مجھے کیا میں تو کسی بات پر سوچ ہی نہیں سکتا

میں اپنے اندر گم نہیں رہتا، میں انٹروورٹ نہیں ہوں لیکن میرے یار دوستوں کو مجھ سے شکایت ہے کہ میں انٹروورٹ ہوں، کیونکہ مجھے ان کی طرح باتیں کرنا نہیں آتی ہیں۔

انٹروورٹ !(Introvert)

اس لقب پر مجھے ہنسی آتی ہے، ہنسی نہیں بس مانو ہلکی سی مسکراہٹ، مگر پھر بھی میں چپ سادھے بیٹھتا ہوں، جب بات کرنی آتی ہی نہ ہو تو خاموش رہنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔

عزیزوں رشتہ داروں میں بھی یہ بات پھیل گئی ہے کہ میں سو کی جگہ صرف ایک بات کرتا ہوں۔

''یہ عقلمندی ہے'' بزرگ فتویٰ دیتے ہیں

''یہ نخوت ہے'' چھوٹے مذاق اڑاتے ہیں

''عقل جب کمال کو پہنچتی ہے تو باتیں خود بخود کم ہو جاتی ہیں''، کم پڑھے لکھے دوست کہتے ہیں۔ ان تمام باتوں کا میرا جواب صرف ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں ان باتوں پر طنز کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس لیے کہ مجھے اپنی خاموشی کا کوئی جواز معلوم نہیں، اب رہا یہ وے کیوم۔ اس کا کیا کروں یہ روز بروز پھیلتا جا رہا ہے، پھیلتا جا رہا ہے، اتنا کہ بعض دفعہ مجھے یہ ساری کائینات اس کے اندر ایک ایٹم معلوم ہوتی ہے۔ اس سے بھی چھوٹی، کسے معلوم کہ اس کیفیت کو کیا نام دیا جائے

آج بارش ہو رہی ہے۔ سارا ماحول سرد ہو گیا ہے، لوگوں نے بش شرٹس اتار کر سوٹ پہن لیے ہیں، مگر میرا یہ وے کیوم کوئی بھی اثر قبول نہیں کرتا ہے، سردی گرمی، چاہے وہ اندر کی ہو یا باہر کی، اس میں کوئی حرکت پیدا نہیں کرتی۔

جب دل میں کوئی جذبہ نہ ہو، فطرت کے یہ رنگا رنگ اظہار کس کام کے؟

وے کیوم کا کیا ہوگا، یہ ویسے کا ویسا ہی رہے گا، بے حس، بے جان، بے حرکت،

آپ ہی کہیے وجود کا کیا مقصد ہے؟ میں کیوں ہوں؟ میں کیوں

نہیں ہوں؟

ہزاروں کتابیں، سیکنڑوں فلسفے پڑھنے کے بعد بھی مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔ میں نے دنیا کے تمام مذاہب پر کھے، سارے نظریئے، مگر میرا سوال اب بھی جواب کے انتظار میں ہے۔ میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا ہوں۔

اس لیے مجھے اپنا جسم، اپنا ہونا، اپنا وجود، بے مصرف، بے مقصد اور بے جان محسوس ہوتا ہے، روبوٹ بھی ایک مقصد رکھتا ہے، اس کو بھی ایک مقصد کے تحت بنایا جاتا ہے اور وہ، وہ مقصد پورا بھی کرتا ہے، میں کیا ہوں؟ کیوں ہوں؟ روبوٹ یا انسان؟ یہ میں کبھی جان نہ سکا۔

لوگوں کے گلے میں زنجیریں پڑتی ہیں۔ کاروبار کی زنجیریں، بیوی بچوں کی زنجیریں، سماج کی زنجیریں، اور ان ہی زنجیروں میں قید ہو کر وہ خچر کی طرح آنکھیں بند کر کے، زندگی کی راہ پر قدم قدم گھسیٹتے ہوئے چلتے ہیں اور کسی انجام تک پہنچ جاتے ہیں۔ مگر مجھے کیا ہوا ہے؟ میں بھی ان زنجیروں کا قیدی ہوں۔ پھر بھی میں کیوں اپنے آپ کو ان زنجیروں سے آزاد، بالکل الگ اور تنہا محسوس کرتا ہوں۔ ان زنجیروں سے آزاد رہ کر بھی کوئی زندہ رہتا ہے؟

صبح دفتر جانا، شام کو واپس آنا، کھانا کھالینا، ریڈیو سننا، اخبار پڑھنا، نون تیل اور دودھ سبزی کا حساب کرنا، انشورنس، جی پی فنڈ، انکم ٹکس،

مکان کا کرایہ، مرنا، جینا، شادی، غم۔۔۔تمام مسائل کا بوجھ اٹھا کر بھی مجھے اپنا آپ آگے پیچھے آزاد، اکیلا اور بندھنوں سے آزاد محسوس ہوتا ہے، میں تنگ آجاتا ہوں، بے چین ہو جاتا ہوں۔ خدا کے وجود پر یقین نہ ہوتے ہوئے بھی بے اختیار میرے منہ سے نکلتا ہے۔

''اوہ مائی گارڈ''

مگر جوں ہی لوگوں نے مجھے اٹھا لیا۔ میرے دل میں کوئی جذبہ موجود نہیں تھا، نہ خوف کا نہ وسوسے کا، نہ ایڈونچر کا۔ ہسپتال میں جب میں سکریننگ پلانٹ کے سامنے آیا تو ڈاکٹر نے میرے زخمی بازو کو کھولا۔ میرے منہ سے چیخ نکلی، صرف جسمانی تکلیف سے، اور میرا جسم سر سے پاؤں تک پسینے سے شرابور ہو گیا، معلوم نہیں ڈاکٹر کیا سمجھ بیٹھا، اس کے ہاتھ کانپے اور اس نے پریشان ہو کر کہا ''شاید فریکچر ہے'' مجھے ڈاکٹر کی پریشانی پر ہنسی آئی۔ وہ حیران ہو گیا، اور جب مجھے ایکس رے مشین کی میز پر چڑھایا گیا۔ تو پھر میرے بازو کو کھولا گیا، میرے منہ سے پھر چیخ نکلی، ڈاکٹر نے ڈرتے ڈرتے کہا ''مجھے لگتا ہے کہ فریکچر ہے''۔

''بس''!

میں نے قہقہہ لگایا، ڈاکٹر نے جھلا کر کہا:

''جناب عالی، آپ کو کیا یہ مذاق لگتا ہے، ان ہڈیوں کو جڑنے میں کم سے کم تین مہینے لگ جائیں گے۔''

''صرف تین مہینے، چہ چہ چہ''

(مجھے یہ سن کر معلوم نہیں کیوں مایوسی ہوگئی)۔

ڈاکٹر نے میرے سر کو سہلایا اور پوچھا۔

''آپ کے سر کو بھی چوٹ تو نہیں آئی ہے''۔

اب میں خاموش ہوگیا، اس بے قوف سے میں کیا کہتا کہ سر میں چوٹ تب لگتی جب اس میں سوچنے کا مادہ ہوتا، خالی کھوپڑی میں کیا چوٹ لگتی؟ ایکسرے فلم دیکھ کر میں کچھ زیادہ ہی مایوس ہوگیا، بازو کی ہڈیاں بالکل ٹھیک تھی، ڈاکٹر خوش تھا اور اس نے انگریزی میں کہا۔

''یو آر ویری لکی، تھینک یور سٹارز''

افوہ

زندگی میں ایک موقع ملا تھا۔ دن رات کے چکر سے الگ ہونے کا، مگر میری بدقسمتی سے یہ بھی ہاتھ سے نکل گیا، بازو کو پلاسٹر سے قید کرنا، ہسپتال کے صاف شفاف، سفید سفید اور گرم گرم بسترے پر لیٹنا، کتنا رومانٹک ہے جو میرے نصیب میں نہیں تھا۔ اور یہ بے وقوف ڈاکٹر کہتا ہے۔

ریلی یو آر ویری لکی۔ آے کن گرے چولیٹ یو

ہونہہ، ایڈیٹ

لوگوں کو کمی ہوتی ہے کسی مادی چیز کی، اور ان چیزوں پر تصرف حاصل کرنے میں ان کی ساری قیمتی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن مجھے کسی بھی

مادی چیز کی کمی نہیں ہے، اسطرح کا کوئی خالی پن نہیں ہے۔ مجھے اندر کا خالی
پن ہے، میرا دل جذبوں سے خالی ہے، میرے دل میں کوئی جذبہ نہیں ہے۔
کسی قسم کا بھی نہیں، خوف، خوشی، غم، رومان، محبت، نفرت کچھ بھی نہیں۔ عقل
کہتی ہے کہ انسان صرف دال روٹی (ساگ بھات) کھا کر ہی زندہ نہیں
رہتا۔ ساگ اور بھات، پانی اور ہوا، یہ انسانی جسم کو زندہ رکھتے ہیں۔ لیکن
انسانی کایا میں اور بھی کچھ ہوتا ہے۔ اس کو بھی رنگا رنگ غذا ملنی چاہئے۔

آج سے کچھ دیر پہلے میں یہ سچائی جانتا تھا۔ اس لئے میں کتابیں
پڑھتا تھا، افسانے لکھتا تھا، ڈرامہ کھیلتا تھا، موسیقی سنتا تھا، فلمیں دیکھتا تھا،
کلب جاتا تھا۔ محفلوں میں جاتا تھا، لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا، ہنستا تھا،
روتا تھا، مگر وہ میرا ماضی تھا۔ میرا آج بالکل بدلا بدلا ہے، مجھے یہ سب فضول
بے ہودہ اور بکواس محسوس ہوتا ہے، کتابیں پڑھ پڑھ کر میرا بھیجا خالی ہو گیا۔
افسانے لکھتے لکھتے میری اپنی زندگی کا افسانہ الجھ گیا۔ ڈرامہ نقل ہے، سمجھے
بغیر گانا وحشتناک ہے، فلمیں بے مقصد ہیں، کلب جانا ریاکاری ہے، محفلوں
میں دوستوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، ہنسنا، کھیلنا ایک تکلف ہے۔ یقین کرو مجھے
اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنا بھی ایک تکلف لگتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟

معلوم نہیں میں کیا چاہتا ہوں، نہیں میں کچھ بھی نہیں چاہتا، کچھ بھی
نہیں۔ مگر پھر دل و دماغ کا وہ کیوم کبھی کھانے کو دوڑتا ہے اور میں سوچتا
ہوں کاش یہ کسی طرح پُر ہو جائے۔ اس کو پُر کرنے کے لئے کیا ہونا

چاہئے ، کسی کی محبت ؟ کسی کی شفقت ؟ کسی کی ہمدردی ؟ اب اگر یہ تمام چیزیں میسر ہو کر بھی یہ وے کیوم ، یہ شنیہ بھر نہیں جائے گا۔ پھر اس کا کیا کریں ؟

افوہ !

میں تنگ بھی نہیں آتا۔

تنگ ہی آ جاتا ، یہ بھی ایک جذبہ تھا ، جو میرے خالی پن کو کسی نہ کسی طرح بھر دیتا۔

''او مائی گارڈ !''

دماغ خالی ہو ، دل خالی ہو ، کیا اس کا کوئی علاج ہے ؟ بارش ہو رہی ہو ، ماحول بھی سرد ہوا ہو ، خوشگوار ٹھنڈ ہو ، اس ٹھنڈ میں سفید لحاف کے اندر سونا ایک لکجری لگتا ہے۔ مگر اس کے لئے جو رات گزرنے پر دن منتظر ہو اور جس کے نصیب میں یہ انتظار ہی نہیں لکھا ہو ، وہ کیا کرے ؟ کہاں جائے ؟

اف !

میرا یہ وے کیوم ! کاش یہ شنیہ کسی طرح سے بھر جاتا !

کردگاری

غلام نبی بابا

﴾غلام نبی بابا (۱۹۲۷، نوہٹہ، سرینگر) محکمہ اطلاعات میں ملازم ہیں۔ ۱۹۵۵ کے بعد افسانہ نگاروں کی جو پود سامنے آئی غلام نبی بابا کا نام بھی ان میں نمایاں ہے۔ افسانوں کے علاوہ انہوں نے ڈرامے، ریڈیائی فیچر اور ایسے لکھے ہیں۔ چونکہ وہ ایسے لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں اس لئے ان کے افسانے بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ کشمیری زندگی کے سیاسی، تمدنی اور معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ انہوں نے انسانی نفسیات اور داخلی مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ کسی بھی انسانی مسئلے کو لے کر افسانہ لکھتے ہیں ''تلخی'' اور ''کردگاری'' اسکی مثالیں ہیں۔﴿

یہ دنیا، میری پیاری ماں اور میرے ساتھ تاریکی اور روشنی۔تاریکی تو بجا ہے لیکن یہ روشنی کیا معنی رکھتی ہے؟ صورتوں کا احساس جب ہی ہوتا ہے جب ان کی پہچان ہو، یہ میری زبان پر تاریکی.اور روشنی ہی کیوں آئی؟ شاید مجھے خود بھی یہ معلوم نہیں یا معلوم ہو بھی تو اندر ہی دبا رہا ہوں۔تاریکی کے سوا زبان پر لانے کے قابل اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔آسمان، آسمان کے تارے، چاند، سورج۔آسمان کے بارے میں کہنے والوں کا کہنا سچ ہی ہو، شاید یہ کہ اسکی کوئی حد ہی نہ ہو، لیکن تاروں کے چمکنے کی میرے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں، ہوگی بھی کیسے؟ جب میرے آکاش پر کبھی کوئی تارہ چمکا ہی نہیں جو اس تاریکی میں میرا راہ نما بن جاتا سورج کے نام پر میری جان قربان، کیونکہ لفظ سنا ہوا ہے۔کیا اس کی گرمی سے انکار کر کے میں ایک حقیقت پر پردہ ڈالونگا؟ مگر اس کے چمکنے سے میں سرے سے ہی انکاری ہوں۔چاند کو دیکھنے کے لئے میری آنکھیں کبھی آسمان کو تکتی ہی نہیں۔چودھویں کا چاند ان ہی کو مبارک ہو جن کے جامِ شراب اس کی بدولت بھر جاتے ہیں۔

کہتے ہیں چاند کی چاندنی میں بہار کی مستی ہے۔ادھر سے سبزہ زار ادھر سے گرتے آبشار! عاشق اور معشوق بانہوں میں بانہیں ڈالے تمام غموں سے آزاد، باغ نشاط یا شالیمار میں ایک دوسرے کے ساتھ شہد سی میٹھی، پیار بھری، ٹھنڈک دینے والی باتوں میں مصروف۔یہ چاہتا کہ یہ سفر کبھی مختصر نہ

ہو، وہ کہتی چاند کبھی ڈوبنے کا نام نہ لے، اس کے نور کو آج رات ہی 'رُمہ ریشی' کی لمبی عمر نصیب ہو' وہ ہماری اس زندگی کو آب حیات سے سیراب کرے۔ظلمت کے خیال سے ہی اسکے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔اور اُسکو بازو سے بازو چھوٹنے کے خیال سے ہی پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔۔۔۔مگر۔۔۔۔۔۔۔مجھے کیا؟

کھونے کا غم اسی کو ہے جس کا کبھی کچھ کھو جائے، میں نے کیا کچھ نہیں کھویا ہے۔ یہ دنیا، جس کی تم اتنی تعریفیں کرتے ہو، اس دنیا کے اشرف المخلوقات، آدھوں کو اپنے ہونے کا احساس ہے تو آدھے پشیمان۔ بہادر چمکتی تلواریں کمر سے باندھے ہوئے تاروں پر کمندیں پھینکتے ہیں، شاید یہ چاند پر بھی جست لگا لیں، میں پنکھ بھی لگا دوں تو کس لئے؟ کیونکہ مرغیوں کی رکھوالی بھی ادائیگی فرض کی حیثیت سے اہمیت رکھتی ہے لیکن مجھ تنہا پرکاہ کو اس گھڑی میں بھی جگہ نہیں ملی۔ میں ہمیشہ اونچ نیچ کو تلاشتا رہا، میں دیواروں کے ساتھ سر نہ ٹکراتا، مگر مجبوری! میں گہرائی میں اترنا نہیں چاہتا، اترے گا وہ جس کو گہرائیوں کی پہچان ہو، میری تو بات ہی نہیں۔ میری یہ چھڑی، جس نے ایک دلدار اور غم خوار بیٹی کی طرح ہر وقت مجھے سہارا دیا، میری ہر اونچ نیچ میں سینہ سپر رہی، یہ بھی مختلف اوقات پر دھوکا کھا گئی۔

اس دنیا کا حسن۔ لفظ حسن سن کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یا تو میرا دل سینے کی ہڈیاں توڑ کر اس لفظ کو کھوجنے کے لئے باہر نکلے گا ورنہ میری آنکھیں

پتھرا جائیں گی۔

اس دنیا کے عالم کہتے ہیں علم کی روشنی الگ ہی ہے اور پہچان کا نشہ بھی جدا، مجھے محسوس ہوا کہ روشنی میں سے ہی روشنی نکل رہی ہے، جس کے پاس جام ہونگے اسی کو ان میں شراب ملے گی۔ میں روز ظلمات میں ڈھونڈتا رہا مگر مجھے آب حیات کہیں نظر نہیں آیا۔

باغ کی نرگس عاشق کی آنکھ بن کر معشوق کی راہ دیکھ رہی ہے، میرے لئے کس کے من میں طلب ہے؟ ہوگی بھی کیوں؟ گل لالہ کے داغ کو تمہاری نظریں اور الفاظ اتنی اہمیت دیتی ہیں۔ لیکن کیا میں دنیا کے ماتھے کا ٹیکہ ہوں؟

غنچوں کی ہنسی، چوٹیوں کا دھوپ میں چمکنا۔۔۔ میرے دل کے تاروں نے اس کا راز جاننا چاہا مگر میرے ذہن نے راستے میں ہی میرا ساتھ چھوڑ دیا، وہ تو روئی کی طرح دُھنا گیا اور میں قسمت کا شکوہ کرتا رہا، سنا ہے کہ باغوں کے پرندے۔ کوئل، بن مینا، ابابیلیں، جل بہت ہی خوبصورت اور خوش کن پرندے ہیں، ان کی بولیوں پر میری روح فدا، مگر ان کا اچھلنا کودنا، ان کے رنگ۔ کتنے خوش آئند رنگ، ان کا پر پھیلانا، ان کی آنکھیں، ان کی گردنوں کے طوق۔ میرے لئے سب بے معنی، ہے نا؟ تم ہی میرے لئے کچھ کرلو، کیا تمہیں حق نہیں؟ جبکہ پرندے میرا حال سنکر گرم فغاں ہوگئے، دور دور سے ہی سہی! بلبل ہی ایک ایسا پرندہ ہے جس نے مجھے

اس کے سوا اور کچھ نہیں دیا کہ میرے دل کے نالوں کو سنا اور جو سیکھا وہی مجھ کو واپس سنایا، پھر بھی میں ناشکر گزار نہیں ہوں۔ جانوروں کو زندگی کے اس انبوہ میں اگر میں بجو کا جیسا نظر آیا اور وہ پیچھے ہٹ گئے تو، مگر حیوانوں نے کیا انسانوں نے بھی مجھے دھکے دیئے بغیر نہیں چھوڑا۔

سن رہا ہوں کہ جھیلوں میں پانی بھر گیا اور ندیاں پانی کے وفور پر ناز کرنے لگیں۔ مگر، میں کیوں چٹانوں کے ساتھ سر پھوڑ دوں؟ ڈل پانی سے مالا مال ہے مگر میری دونوں جھیلیں سوکھ گئی ہیں اسی لئے پمپوش (کنول) نے سینہ چاک کیا اور سینے کے سوراخوں میں تیروں کی انیاں دور سے نظر آتی ہیں۔ اس کے پتوں نے اس کے لئے موتیوں کے قاب بھر دیئے لیکن اس کے زخم آہستہ آہستہ بند ہو گئے جو کسی بھی وقت پھوٹ سکتے ہیں، پمپوش اور ان پھولوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، جنہوں نے لوگوں کے دامن بھر دیئے اور میرے لئے ہر راستے پر کانٹے بچھا دیئے۔ پہچاننے والوں نے گلاب کو سر پر سجایا مگر مجھے خوشبو سونگھا کر میرا انداق اڑایا۔ سنبل، یاسمین، نرگس نے بھی اُنھیں سے پیار کیا جو اردگرد جام ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گئے۔ آفتاب غروب ہوا۔ وقت نے لوگوں پر سونا نچھاور کر دیا اور میرے چہرے پر گردہ ہی چپک گیا، پاؤں چاک ہو گئے، خون بہنے لگا، ہائے وہ میرا تن بدن ہی جانتا ہے، وقت نے کیا کچھ نہ محسوس کرایا، لرزہ طاری کر دیا، یہ بھی سنا ہے کہ کچھ لوگ کھڑکیوں پر بیٹھ کے برف کے گرتے گالوں کا لطف

اٹھاتے ہیں ایسا ہی لطف جیسا مجھے ان پر رشک کرنے میں آیا ہے

رہا بجلی کا چمکنا، اس کی میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں، کوئی وجود نہیں، بادلوں کا گرجنا مجھے خوامخواہ ڈراتا ہے۔ ڈرتا رہتا ہوں کہ کہیں بجلی مجھ پرہی نہ گرے۔ کالے بادلوں نے خود کو مجھ سے چھپائے رکھا۔ کیا ان باتوں سے میرا دل پھٹ نہ جائے گا۔ ہاں تم مجھ پر پتھر ہی مارو لیکن میرے ساتھ ہوا ہی ایسا کہ میں بس روتا ہی رہا، رونے کا جواز ہے نا؟ میری ماں یوں ہی زار زار روتی نہیں تھی؟ میرے درد میں روتے ہوئے اس کی آنکھوں کی بینائی چلی گئی۔ وہ رورو کر کہتی تھی، میرے بیٹے، میری آنکھوں کی روشنی، جب تم نے ہنسنا کھیلنا شروع ہی کیا۔۔۔۔ اس سے آگے بھی وہ کچھ اور کہتی لیکن اسے روتے روتے ہچکیاں لگ جاتیں اور پھر پہروں نہیں سنبھلتی۔ شاید وہ مجھ سے کہنا چاہتی تھی کہ میری پیدائش سے پہلے اس نے کیا کیا امیدیں باندھ لی تھیں جو میرے پیدا ہونے کے بعد پوری نہ ہوئیں۔ میں یہ سب سمجھ گیا تھا۔ وہ بہت سی راز کی باتیں مجھے بتانا چاہتی تھی جو بتانے سے رہ گئیں۔ میں ہمیشہ بے خبر ہی رکھا گیا۔ اگلوں نے کہا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ہی وہ باتیں سمجھادی ہیں، کونسی باتیں؟ سننے کے قابل باتیں! کہ اگر وہ مجھ جیسوں کو روشنی کے راز سے واقف کردیتا تو مجھ جیسے اندھے نہ جانے اس دنیا کو کس الجھاؤ کا شکار کرتے، معلوم نہیں کس الجھاو میں پھنسادیتے، معلوم نہیں کیا تہ وبالا کر دیتے؟ اندھاپن۔۔۔۔ ہاہاہا۔

کیا ہو جاتا اگر میں صرف بچوں، ان معصوم بچوں کے میلے اور صاف چہروں میں فرق کر کے ان کے ماں باپ کے سامنے ایک پر معنی تقریر کر سکتا، سنتا ہوں، ان بچوں کے گورے گورے چہرے، لال لال رخسار اور ان رخساروں پر ماں کے شہد بھرے ہونٹوں کے بوسے۔۔۔۔معلوم نہیں کیوں ماں باپ کی آنکھیں بچوں کی آنکھوں کے آئینے میں دیکھ دیکھ کر، دنیا اور عقبیٰ سے بے خبر ہو کر ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں راحت بخش چشمے ہی چشمے ہیں، کہتے ہیں یہ سب دیکھنے کے لائق ہوتا ہے، اور ان راحت بخش چشموں میں ڈوب جانے میں بہت لطف ملتا ہے۔

کیا یہ ان کے الفاظ ہیں یا میں ہی بہک گیا ہوں؟

تم ہی ہو تم ہی ہو

اختر محی الدین

✿اختر محی الدین (۱۹۲۸۔۲۰۰۳ بٹہ مالو، سرینگر) نے ۱۹۵۵ سے کشمیری میں افسانے لکھنے کی ابتدا کی۔ ان کا شمار کشمیری زبان کے بلند پایہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کشمیری میں سنجیدگی اور ثابت قدمی کے ساتھ افسانے لکھے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ست سنگر'' ۱۹۵۶ میں منظر عام پر آیا اور اسی سال اس کتاب پر ان کو ساہتیہ اکاڈمی اوارڈ سے نوازا گیا۔ بعد میں دو اور افسانوی مجموعے ''زُو تہ زولانہ'' (جان اور بیڑیاں) ''سونزل'' (دھنک) شائع ہوئے ہیں۔ انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں، ان کے ایک ناول'' دود تہ دگ'' (درد و کرب)، کو کشمیری زبان کا پہلا ناول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اختر محی الدین کے افسانے کشمیری ماحول اور معاشرے کی زندہ تصویریں ہیں۔ ''دریاوی ہند بیزار'' (سلک کی شلوار) اور ''شینہ جنگ'' (برف کی جنگ)

اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ان کی نظر زندگی کے حقیقی واقعات
اور زندہ کرداروں پر رکتی ہے۔ ۱۹۶۰ کے بعد
انہوں نے جدیدیت اور نئی حسیت کی آگہی کے تحت تجریدی
اورعلامتی افسانے بھی لکھے ہیں۔''گہے تاپھ گہے شہل''(کبھی
دھوپ کبھی چھاؤں)''روتل''(رات)''ژس''(خجالت)
اور''ژی چھک ژی چھک''(تم ہی ہوتم ہی ہو) علامتی
افسانے ہیں جوادبی حلقوں میں پسند کئے گئے۔

☆☆☆
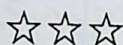
اب کہیں یہ ہوا کہ میری نظریں کھل گئیں، یہ نہیں کہ مجھے کچھ نظر آرہا
ہے یا کسی کی موجودگی کا احساس ہورہا ہے۔ ہرگز نہیں۔مگر وہ اندھیرا نہیں رہا
جوڈراونا تھا، جو بھٹکانے والا تھا، کچھ اندازہ سا ہو رہا ہے کہ پس دیوار کوئی
ہے یا کچھ ہے۔''یاہو، یاہو''! سانس لینے کی آواز آرہی ہے
مگر اس دیوار کے پیچھے کون ہوگا یا کیا ہوگا؟ میں نے کہا نا کہ ابھی
اندھاپن گیا نہیں۔
میری آنکھوں میں آج بھی تاریکی سی ہے مگر اس تاریکی میں سفیدی

کا احساس ہو رہا ہے۔ اور اس احساس نے مجھے مار ڈالا، ورنہ کیا میں پاگل

تھا۔ مجھے خود مستی کے وہ دن یاد آتے ہیں جب میرے بال سیاہ تھے کوئے

کے پر جیسے۔ اور لگتا تھا اندر کا شاہباز نیلے آکاش میں پر پھیلائے ساری

کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ اندھیرا رنگوں کا سرتاج ہے۔ وہ زمانہ تھا جب میں راہ چلتے ہوئے بجلی کے کھمبوں کو سر سے ٹکریں مارتا اور باقی نشہ کرنے والوں یا اندھوں کے سامنے قسم کھا کے کہتا تھا، ''ختم کیا''

نمرود کو جب غصہ آیا تو اس نے ایک تیر اٹھایا اور آسمان پر چلایا، کہتے ہیں آسمان سے خون برسا اور شور برپا ہوا ''مر گیا' مر گیا''

وہ نمرود میں ہی تھا جس نے تیر چلایا اور وہ چرسی بھی میں ہی تھا جس نے بجلی کے کھمبے کو سر سے ٹکر ماری اور دوبار میں نے ہی شور مچایا ''مر گیا مر گیا''۔ یہ شور میں نے پورے خلوص کے ساتھ مچایا، میں اس کو مرتے ہوئے دیکھ رہا تھا مگر اب وہ ڈراونا اندھیرا نہیں رہا، وہ بھٹکانے والا اندھیرا،

اب محسوس ہوتا ہے کہ اس دیوار کے پار۔ مگر کیا؟

''پار کون ہے''؟ سوچتا ہوں کہ زور سے پکاروں۔ مگر ڈرتا ہوں کہ کانپتا ہوں کہ کہیں وہاں سے بھی یہی پکار نہ آئے اور میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاوں کہ میں کون ہوں۔ مگر میں کیا کہوں گا؟ مجھے کہاں معلوم ہے کہ میں کون ہوں۔ اتنی بصارت مجھ میں کبھی تھی ہی نہیں کہ خود کو دیکھ پاتا، میرے

سوال کی صدائے بازگشت سنائی دے تو میں کیا جواب دوں؟

میرے ہونٹوں پر اندھی مسکراہٹ ہوگی اس لئے کہ میں صرف اپنے ماضی کو رہ رہ کر یاد کر رہا ہوں اور خوش ہو جاتا ہوں۔ میری بھویں خوف سے لرزتی ہونگی۔ اس لئے کہ آج مجھے اپنے تمام اعمال گناہ لگتے ہیں، جو مجھ سے اس زمانے میں سرزد ہوئے جب میں نمرود تھا۔

مصر کے تخت پر بیٹھ کر اپنے آپ کو سب سے اونچا سمجھتا تھا، عقل نے سمجھایا تھا کہ آسمان کا کوئی وجود نہیں، پہاڑ بہت دور تھے، اسلئے میں سب سے اونچا تھا اور اس بلندی سے جب میں پکارتا تھا ''کچھ نہیں ہے میرے سوا'' مجھے لگتا تھا کہ یہ میری آواز کائنات میں گھوم کے پھر واپس میرے پاس آتی ہے۔ اس کے بعد میں اپنے درباریوں سے کہتا ''دیکھا کس طرح میری آواز پوری کائنات کا احاطہ کر کے پھر میرے پاس لوٹی ہے، اگر کوئی رکاوٹ یا کوئی اور حائل ہوتا۔۔۔۔۔''

میرے درباری میرے تخت کے ستونوں کا سجدہ کر کے کہتے ''برحق، تم ہو، صرف تم'' ان کے اقرار سے مجھے یقین ہوتا تھا اور یہ یقین اور گہرا ہو جاتا تھا جب سونے کے پنجرے میں طوطا بولتا ''تم ہی ہو، تم ہی ہو'' اس طوطے کی آنکھیں اصلی موتی کے دو دانے تھے۔

سچ مانو مجھے آسمان پر تیر چلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آسمان ایک خلائی سراب ہے، مگر کچھ موساؤں کو یقین دلانے

کے لئے کہ میں یہ بھی کرنے کا اہل ہوں، میں نے تیر اٹھایا اور آسمان پر چلایا، تو پہلی بار میری بھویں خوف سے لرز گئیں جب وہاں سے خون برسا۔ ''جب کچھ نہیں تھا تو مرا کیا''

میں سوچ رہا تھا کہ آسمان سے خون برسنا بند ہو جانا چاہئے، رودنیل کا پانی سرخ ہو گیا، کنارے سرخ ہو گئے، گردوپیش خونین ہو گیا، اور میری بھووں کی تھرتھراہٹ فزوں ہو رہی تھی، میرے دماغ میں کانٹے چبھ رہے تھے، ''جب کچھ نہیں تھا تو مرا کیا؟''

یقین کرلو اسی لمحے سے مجھے شبہ ہونے لگا کہ دیوار کے پیچھے کچھ ہے، ''یہ کچھ'' خون بہا رہا ہے، مگر زندہ ہے۔ کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے۔ کہ خون اسی سے نہیں بہہ رہا ہو بلکہ میری یہ آنکھیں یرقان زدہ ہوں اور مجھے وہ رنگ دکھائی دے رہا ہے جو اس کا رنگ نہیں۔

بادشاہ اپنے اصلی خیالات کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرسکتے۔ نمرود موسیٰ کے کہنے پر یقین نہیں کرسکتا تھا، اسلئے میں نے شور مچایا، ''اگر کچھ تھا بھی، اب نہیں رہا'' اسلئے موتیوں جیسے آنکھوں والے میرے طوطے نے شور مچایا ''تم ہی ہو، تم ہی ہو'' پروپگنڈا کن کن موساؤں کی بولتی بند کردیتا۔ یہ یاد کر کے میرے ہونٹوں پر اندھی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ میں نے وہ جنگ جیت لی۔ بیچارہ موسیٰ لاچار ہو گیا۔ بہت سمجھایا لیکن کسی نے اس کی بات نہ مانی، مگر مجھے یقین سا ہو گیا تھا اور سوچ رہا تھا '' کچھ نہیں تھا، پھر کیا مرا''

پھر میں نے قبر بنوائی ۔ملکوں ملکوں سے سنگ تراش آئے اور کاری گری کے نمونے بنانے شروع کیئے ۔ مجھے شوق تھا کہ قبر میں مجھے ہر طرح کا آرام ملے ۔کہیں سے کوئی کیڑا نمودار نہ ہو جائے ،قبر ساونڈ پروف بنوا رہا تھا، اور ایسے پتھر لگوائے جو دھوپ کی تمازت سے تپ نہ جائیں۔

کاری گر میری عقل کی تعریف کر رہے تھے تو موتیوں جیسے آنکھوں والا طوطا پکارتا تھا ''تم ہی ہو، تم ہی ہو''

مگر میرے اندر کوئی خوف تھا کہ قبر میں کیڑے مکوڑے مجھ پر حملہ آور ہونگے ، اگر میری قبر ساونڈ پروف نہ ہوگی تو میرا رونا راہ چلتے لوگ سن لیں گے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پتھروں کو جہنم کی آگ گرمانے کی کوشش کرے ۔یہی خوف تھا اور اس لئے قلعہ جیسی قبر بنوا رہا تھا ۔ یہ خوف اسی دن پیدا ہوا تھا جس دن میں نے آسمان پر تیر چلایا اور وہاں سے خون برسا'' کچھ نہیں تھا تو مرا کیا تھا؟''

یہ آر اور پار والی دیوار ایک بڑا کھیل ہے ۔ میں قرنوں سے سانپ کی طرح کینچلی بدلتا ہوں ، ہر جنم میں ، میں خلوص کے ساتھ یقین کر کے کہتا ہوں کہ میں نے وہ کیا جو نیا ہے اور جو آج تک کسی نے نہیں کیا ہے اور ہر جنم میں آسمان پر تیر چلاتا ہوں یا بجلی کے کھمبوں کو سر سے ٹکریں مارتا ہوں ۔ ہر جنم میں وہی ایک رنگ پہچانتا ہوں جو میرے خیال میں سب رنگوں کا سرتاج ہے ۔۔۔۔اندھیرا!

مال دید

صوفی غلام محمد

صوفی غلام محمد (۱۹۳۰ بچھوارہ سرینگر) نے اپنی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا ہے اور پوری زندگی صحافت سے ہی جڑے رہے۔ وہ ریاست جموں وکشمیر کے معروف اخبار سرینگر ٹائمز کے ایڈیٹر ہیں۔ ۱۹۵۴ کے بعد سے وہ افسانے بھی لکھتے رہے۔ ان کے افسانوں اور خاکوں کے مجموعے ''شیشہ تہ سنگستان'' اور ''لوس متی تارکھ'' (ڈوبے ہوئے تارے) عوامی سطح پر مقبول ہوئے۔ ان کا تازہ افسانوی مجموعہ ''مال دید'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کے افسانے بھی حقیقت پسندی کے آئینے ہیں۔ وہ کشمیر کی سماجی اور تمدنی زندگی کے زمینی حقائق وواقعات کو سامنے لاتے ہیں۔ اور زبان اور کردار کے ذریعے کشمیری ماحول کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ ژنہ ژور (کوئلہ چور) اور ''مال دید'' ان کے مشہور افسانے ہیں۔ ''مال دید'' افسانے میں مال دید ایک زندۂ جاوید کردار ہے۔

مال دید آج قریباً ایک ماہ بعد پھر بازار میں آئی۔اس کے آنے سے بازار میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ ہر دکان دار اور ہر خریدار فقط مال دید کی طرف دیکھ رہا تھا۔سب اسکو مبارک باد دے رہے تھے۔مال دید اچھی ہو؟ ٹھیک ہو؟ اب تک کہاں چھپی ہوئی تھی؟ مال دید آج موٹی ہوگئی ہو۔

کچھ دکاندار دکانوں پر بیٹھ کر ہی مال دید کی خیریت پوچھ رہے تھے اور کچھ دکانیں چھوڑ کر آئے تھے اور مال دید کو گھیر لیا تھا۔سب اسے پوچھ رہے تھے کہ وہ اب تک کہاں تھی۔آج وہ پورے ایک ماہ کے بعد شہر آئی تھی۔مال دید ہنس کر سب کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔وہ اس ایک ماہ تک کہاں تھی اور اس نے شہر آنا کیوں چھوڑ دیا تھا۔اس کے بارے میں وہ خاموش تھی۔اصل میں بازار والوں کو معلوم تھا کہ مال دید کہاں تھی اور اس کے شہر نہ آنے کی وجہ کیا تھی، پھر بھی وہ اس سے یہی ایک سوال پوچھ رہے تھے کہ وہ کہاں تھی؟ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ سوال پوچھنے سے اس کی دکھتی رگ پر چوٹ پڑتی ہے۔مال دید کی کوشش تھی کہ وہ بازار والوں کے اس سوال کا جواب نہ دے اس لئے وہ ادھر ادھر کی بات کر کے اسکو ٹال رہی تھی۔لیکن لوگوں کے منہ بند کیسے کئے جاسکتے تھے؟ اگر ایک ہوتا، دو ہوتے، تین ہوتے تو ان کے سوالوں کے جواب دئے جاتے مگر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بازار میں چالیس دکاندار تھے، ان سب کے منہ مال دید

کیسے بند کرتی؟ ایک طرف سے سلام لانگرو، اسکا مذاق اڑا رہا تھا، اور دوسری طرف سے حبیب دھنیا اس کو اکسا رہا تھا، مامہ پاٹھ گرو دکان پر بیٹھ کر ہی دھاگا لپیٹ رہا تھا۔ اور اس کی طرف بھی آوازے کس رہا تھا۔ او مالہ تو کہاں تھی؟ آج تم اللہ قسم میم صاحبہ جیسی لگ رہی ہو۔ مامہ پاٹھ گرو بازار کا سب سے بزرگ دکاندار تھا۔ سب اس کی بزرگی کا احترام کرتے تھے۔ لیکن جب دکاندار آپس میں ہنسی مذاق کرتے تو اس وقت وہ چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔

قادر قلعی گر تو اپنی طرف سے اپنے کام میں مصروف تھا، وہ روئی سے ایک برتن کو رگڑ رہا تھا مگر رگڑتے ہوئے وہ مال دید کی طرف دیکھکر کھانس رہا تھا۔

مال دید یہ باتیں اور یہ مذاق چپ چاپ سن رہی تھی، کسی سے کچھ نہیں کہتی تھی، اگر کوئی اور وقت ہوتا یا کوئی اور بات ہوتی تو سب کا منہ بند کر دیتی۔ جب مذاق کرنے پر اتر آتی تھی تو وہ مامہ پاٹھ گرو کا لحاظ بھی نہیں کرتی تھی۔ قادر قصائی تو شیطان مانا جاتا تھا، لیکن وہ بھی مال دید سے پناہ مانگتا تھا۔ مگر آج مال دید کے منہ میں زبان نہیں تھی۔ اس کے چہرے پہ شرم کا سایہ تھا۔

مال دید بٹہ پورہ کی سبزی والی تھی۔ بٹہ پورہ شہر سے چار پانچ میل دور تھا۔ اگر چہ مال دید چالیس سال سے اوپر تھی لیکن پھر بھی وہ ابھی جوان

لگ رہی تھی ۔ قادر قصائی اس سے کہتا تھا کہ چار بچوں کی ماں ہوکر بھی تم ڈولی میں بٹھائی جانے والی نئی نویلی دلہن لگ رہی ہو، حالانکہ مال دید کے بارے میں اسکی رائے غلط تھی مگر یہ صحیح تھا کہ مال دید ابھی بھی خوش شکل تھی ۔ جسمانی طور پر توانا تھی، کافی مضبوط تھی ۔ بھرا ہوا چہرہ مضبوط ہاتھ پاوں، اسکی ساتھی سبزی بیچنے والیاں اسکوموٹی کے نام سے پکارتی تھیں ۔ مال دید کی صرف یہی خصوصیت نہیں تھی کہ اس کا چہرہ بھرا ہوا اور گورا تھا اور جسم بھی طاقت ور تھا بلکہ اسکی سب سے بڑی خوبی زبان کا برتاو تھا اور اسی بول چال کی خوبی سے ساگ سے بھرا ٹوکرا منٹوں میں بیچ دیتی تھی ۔ اگر چہ وہ ساگ بیچنے شہر آتی تھی لیکن وہ راستے میں ہی آدھے سے زیادہ بیچ دیا کرتی تھی ۔ وہ منہ اندھیرے گھر سے بھرا ہوا ساگ کا ٹوکرا لے کے نکلتی تھی اور راستے میں چلتے چلتے مختلف طبقوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے گھروں کی خواتین کو ساگ دیتی تھی ۔ ان خواتین میں وہ بھی تھیں جو گھروں سے قدم باہر نہیں نکالتی تھیں شرم دار خواتین جو اپنے مرد کے سوا کسی غیر کے سامنے نہیں آتی تھیں ۔ مال دید ان تمام امیرزادیوں، آپاؤں اور پیرزادیوں کو ایک ایک کر کے اچھی طرح جانتی تھی ۔ ان خواتین کو بھی جو گلی کوچوں اور سڑکوں پر مردوں کی طرح گھومتی تھیں ۔

مال دید کا سودا کرنے کا طریقہ عجیب تھا ۔ وہ دوسری سبزی بیچنے والیوں کی طرح ہانک نہیں لگاتی، نہ خود ہی اپنے ساگ کی تعریف کرتی

تھی ۔اس کا عقیدہ تھا کہ جس کو ایک بار ساگ دو وہ خود دوسری بار لینے آئے اور اس کے ساگ کی تعریف کرے۔ ایسا ہی ہوتا تھا، گھر سے نکلتے ہی شہر تک ہر دروازے سے اس کو آواز دی جاتی تھی۔ اگر کوئی خاتون کبھی اس سے ساگ اچھا نہ ہونے کی شکایت کرتی تو اس کو ایسا جواب دیتی کہ اس کی بولتی بند ہو جاتی۔

تم ساگ پکانا کیا جانو اگر میرا ساگ ٹھیک سے پکایا ہوتا تو یہ شکایت نہیں کرتی، دیکھو ناراض نہ ہونا ساگ وہ نہیں ہے جس کو پانی میں ابالا جائے۔ ساگ کو زیادہ تیل چاہئے، اس میں مسالہ ڈالنا ضروری ہے۔ اور یہ چیزیں ہونے کے باوجود اگر پکانے والی اچھی نہ ہو، اس کا سارا مزہ ہی خراب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ساگ نہیں رہتا بلکہ مویشیوں کو کھلانے کی گھاس بن جاتا ہے۔

مال دید صرف اپنے کام ہی میں ماہر نہیں تھی بلکہ جس طرح یہ جانتی تھی کہ کس زمین میں ساگ کی کتنی فصل ہوگی اور کس جگہ کا ساگ مزے دار ہوتا ہے اور اسی طرح وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کس گاہک کے ساتھ کیسے پیش آنا چاہئے۔ وہ بڑے کے ساتھ بڑا اور چھوٹے کے ساتھ چھوٹا بنتی تھی۔ اور مردوں کے ساتھ مرد اور عورتوں کے ساتھ عورت۔ امیر گھرانے میں جاتی تو امیرانہ انداز ہی اختیار کرتی تھی اور جھگڑالو لوگوں کے ساتھ جھگڑالو ہی بنتی تھی۔ لیکن کبھی کسی خریدار کو یہ شکایت نہ تھی کہ وہ ایک سے ایک اور دوسرے

سے دوسری قیمت وصول کرتی ہے۔

مال دید کے اسی سلوک نے اس کے خریداروں میں اضافہ کیا تھا۔ جب مال دید آتی تھی تو بازار میں رونق آتی تھی۔ بازار میں ہر قسم اور ہر پیشے کے دکاندار تھے۔ ان کی دکانوں میں ہزاروں کا مال تھا۔ مال دید کی اپنی کوئی دکان نہیں تھی۔ اگر تھی تو وہی ساگ کا ٹوکرا تھا۔ جو وہ گھر سے سر پر لاتی تھی۔ مال دید اس بازار کی زندگی تھی۔ نہ بساطی کی دکان میں وہ خاصیت نہیں تھی جو مال دید کے ساگ کے ٹوکرے میں تھی جس کے اردگرد خریداروں کی لائن لگی ہوتی تھی۔ اس کے آتے ہی دکاندار اس کے ساتھ مذاق کرنے لگتے اور وہ مذاق کا جواب مذاق سے ہی دیتی تھی۔

مال دید آج تمہارا چہرہ لال کیوں ہے؟

کیوں نہیں ہوتا، تمہاری طرح سوکھی سڑیل ہوں کیا؟ جوانی ہوگی تو چہرے پر لالی بھی ہوگی۔

مال دید کو جوانوں سے ویسی ہی الفت تھی جیسی بوڑھوں کے ساتھ۔ اس کے ساگ کے ٹوکرے کے گرد دس بیس جوان بھی ہوتے تھے جو اسے ہر بار کہتے تھے،

''افسوس تجھے ایکٹرس ہونا تھا، مدھوبالا اور نرگس کو بھی مات دیتی''،

داڑھی والے بزرگ بھی اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے تھے۔ مال دید کی یہ مقبولیت باقی سبزی بیچنے والیوں کو اچھی نہیں لگتی تھی، جتنا وہ اپنے گاہکوں اور

بازار کے دکانداروں میں ہردلعزیز تھی اتنا ہی وہ ہم کار خواتین کو بری لگتی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ یہ مرجائے اور سارا کاروبار ان کے ہاتھ لگے، دن رات وہ اسکو بددعائیں دیتی تھیں۔ یہاں تک کہ اسکے خلاف تعویز گنڈے بھی کرتی تھیں اور جادوٹونا بھی۔ لیکن مال دید اور اسکے کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس کے خریداروں کو اس کے خلاف بھڑکایا جاتا تھا جن امیر گھرانوں میں وہ جاتی تھی ان سے کہا جاتا کہ وہ بدماش عورت ہے، اس کی نظر خراب ہے، لیکن ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اہوں نے ساگ کم قیمت پر بیچنا شروع کیا، مگر مال دید ترقی ہی کرتی گئی، وہ جب کس دکاندار کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوجاتی تھی تو تمام ساگ بیچنے والیوں میں آگ لگ جاتی تھی اور ایک دوسرے کی طرف دیکھکر دل کی بھڑاس نکالتی تھیں۔

''دیکھ اس میں غیرت نام کی کوئی چیز ہے؟ اس نے ہمارا نام بدنام کیا، دیکھ کس طرح یار کے ساتھ باتیں کررہی ہے۔''

مال دید اس جگہ بیٹھتی تھی جہاں دوراہا تھا اور دونوں راستوں پر نظر رہتی تھی، پیچھے سے گلی تھی، اس گلی سے محلے کی خواتین اس کے پاس آتی تھیں ساگ لینے کے لئے۔ باقی ساگ بیچنے والیاں تو اس جگہ کے لئے خار کھائے بیٹھی تھیں۔ کئی بار اس پر مال دید کے ساتھ جھگڑا کیا، مگر وہ کچی گولیاں نہیں کھیلی تھی کہ یہ جگہ چھوڑ دیتی، اور جھگڑے میں سارا بازار مال دید کا ساتھ دیتا تھا۔ ایک دن کمیٹی کا جمادار اس کے پاس آیا جس کو اس کی حریفوں نے

رشوت دی تھی، کہ مال دید کو اس جگہ سے ہٹا دو، اس نے مال دید سے کہا کہ تم اس جگہ کوڑا ڈالتی ہو کہیں اور بیٹھ کے ساگ بیچو، مال دید سمجھ گئی کہ اسکو کس نے بھکایا ہے وہ کام کا وقت تھا، مال دید نے جمادار سے کہا، اچھا اس وقت معاف کرو کل میں دوسری جگہ بیٹھوں گی۔ کل وہ جمعدار کو ایک طرف الگ لے گئی، آٹھ آنے اس کے ہاتھ میں رکھ دئے اور کہا، ''کسی اور کے بھکاوے میں مت آیا کرو، لو تمبا کو پیو، دوبارہ کبھی یہاں تنگ کرنے نہیں آنا۔ اس کی اس بات اور آٹھ آنوں سے جمعدار موم کی طرح نرم پڑ گیا، پھر کبھی اس نے اسے یہ نہیں کہا کہ تم کوڑا ڈالتی ہو۔ وہ ساگ بیچنے والیاں جتنے ہتھکنڈے اس کے خلاف استعمال کرسکتی تھیں کر لئے لیکن سب فیل ہو گئے۔ مگر کہتے ہیں نا کہ کوئی نہ کوئی پتھر لگ ہی جاتا ہے، یہی مال دید کے ساتھ بھی ہوا۔

ایک دن مال دید کے شوہر کریم سبزی والے سے کہا گیا کہ مال دید گھر سے نکل کر یاروں کے ساتھ گل چھرے اڑاتی رہتی ہے، شروع میں اس نے ان باتوں پر یقین نہیں کیا۔ لیکن جب ایک نے بھی کہا اور دوسری نے بھی، وہ سوچ میں پڑ گیا۔ سبزی والیوں نے اس سے کہا کہ مال دید کو قادر قصائی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں، قادر قصائی کا نام اس لئے لیا گیا کہ مال دید قادر قصائی سے ہی گوشت خرید کے گھر لے جایا کرتی تھی، وہ سارے دکانداروں میں کم عمر تھا اور اس کا رنگ بھی صاف تھا۔ اور اسکی عادت تھی

جوں ہی مال دید بازار میں آتی تھی وہ اس کے ساتھ مذاق کرنے لگتا تھا۔ان الزامات کی صداقت جاننے کے لئے کریم سبزی والے نے اپنی بہن کوشہر ساگ لے کر بھیجا۔اس دن بھی قادر قصائی نے مال دید کے ساتھ ہنسی مذاق کیا،مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی نند آج شہر کس غرض سے آئی ہے،اگر معلوم ہوتا تو وہ دکانداروں کے ساتھ ایسے بات نہ کرتی جیسے وہ کیا کرتی تھی ، اسکی نند نے جو کچھ دن کو دیکھا، وہ شام کو اپنے بھائی سے کہہ دیا۔یہ مال دید کا اس بازار میں آخری دن تھا۔دوسرے دن جب مال دید کے بدلے اس کا شوہر ساگ لے کر بازار میں آیا، دکاندار ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔آج مال دید کی جگہ دوسری سبزی بیچنے والی بیٹھ گئی۔گاہک جو مال دید کے منتظر تھے، ہکا بکا ہو کے رہ گئے۔

مال دید کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آئی ؟ معلوم نہیں خیریت سے ہے؟ سب یہی پوچھتے رہے۔بازار سونا سونا اور خالی خالی لگ رہا تھا۔کریم سبزی والے سے کوئی یہ نہیں پوچھتا تھا کہ وہ آج خود ہی کیوں آیا ہے۔وہ دکانداروں کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا، اسکو وہ سارے اپنے دشمن لگ رہے تھے۔قادر قصائی مونڈے پر چھرا چلاتا تھا تو اسکو لگتا تھا کہ چھرے کا وار اس کے سینے پر پڑتا ہے۔خریدار آ کر مال دید کو نہ دیکھکر مجبوراً دوسری سبزی والیوں کی طرف جانے لگے، آج ان سبزی والیوں نے ایک عرصہ بعد خریداروں کا منہ دیکھا تھا۔وہ آج اپنی چالاکی پر خوش تھیں۔کبھی بازار

والوں کی طرف دیکھتی تھیں اور کبھی کریم سبزی والے کی طرف۔ کریم کا خیال تھا کہ جن خریداروں کو اسکی بیوی مال دید ساگ بیچتی تھی، وہ سب اس کے پاس آئیں گے، لیکن اس کا خیال غلط نکلا، پہلے دن اس نے ساگ کا ٹوکرا بیچ ہی ڈالا کسی نہ کسی طرح سے، لیکن دوسرے دن وہ نصف سے زیادہ ساگ گھر واپس لے گیا۔ اب مال دید کے گاہک ایک ایک کر کے دوسری سبزی والیوں کے پاس جانے لگے، یہ ان کی جیت تھی، پہلے تو وہ صبح سے شام تک گاہک کے لئے ترس جاتی تھیں۔ مال دید جو پیسہ گھر لے جاتی تھی، اب ان کی جیب میں جانے لگا۔ ایک دن اگر کوئی خریدار کریم سبزی والے سے ساگ لیتا تھا، دوسرے دن وہ آتا ہی نہیں تھا، جو آتا وہ صرف مال دید کے ساگ کی تعریف کرتا تھا، وہ حیران ہو جاتا کہ وہ بھی تو وہی ساگ بیچتا ہے جو وہ بیچا کرتی تھی، اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کے آنے سے اس ساگ کا مزہ کیسے بدل گیا۔ روز بہ روز اس کے خریداروں میں کمی ہوتی گئی اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ کریم سبزی والا پورا ساگ کا ٹوکرا واپس گھر لے گیا۔ شہر آنے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ اب صرف احساس غیرت سے شہر آتا تھا۔ اس غیرت نے اس کا بہت نقصان کیا۔ وہ نقصان پر نقصان برداشت کرتا رہا۔ آخر کب تک؟ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک دن وہ تھک ہار کے گھر واپس آیا اور آہ بھر کے بیوی سے کہا۔

بلا مارو اس سبزی بیچنے کو، میں اب مزدوری کرونگا، مجھے اس سے کچھ

حاصل نہیں ہوا۔

کیوں کچھ حاصل نہیں ہوا؟ جب اوروں کو فائدہ ہوتا ہے، تمہیں کیوں نہیں ہوا؟

یہ مجھے معلوم نہیں، میرا ساگ جیسے خریداروں کو زہر لگتا ہے۔

یہ سن کر مال دید نے قہقہ لگایا اور خاوند سے کہا،

بازار وہ نکلتے ہیں جو مرد ہیں، زنانیاں نہیں

سنتے ہی کریم بھڑک اٹھا

کیا میں زنانی ہوں؟

اور کیا ہو؟ جو عورتوں کی باتوں پر کان دھرے وہ زنانی نہیں تو اور کیا ہے۔

پھر وہ جھوٹ ہے جو میں نے سن لیا؟

جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے۔ میں اپنے کام کی خاطر لاکھوں میں اٹھتی بیٹھتی ہوں مگر اپنی عزت کی حفاظت کرتی ہوں۔ کاروبار کرنا مذاق نہیں ہے، یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے، جو عورت کام کرنے لگتی ہے اس کو جلتی آگ پر سے چلنا ہوتا ہے۔

بیوی کی یہ باتیں سن کر کریم کی گردن خود بخود جھک گئی۔ وہ اس کے آگے اپنے کو گنہگار محسوس کرنے لگا۔ وہ اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا، مگر زبان گنگ ہوگئی تھی۔

اب تم کیا سوچ رہے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اب تک جو ہوا سو ہوا، مجھے اجازت دو کہ میں کل پھر ساگ لے کر بازار جاوں، پھر دیکھو اللہ کیا کرتا ہے۔

کریم خاموش رہا۔ اس خاموشی کا مطلب تھا کہ اس نے اسکو اجازت دے دی۔

صبح مال دید پھر شہر کی طرف چل پڑی ویسے ہی سر پر ساگ کا ٹوکرا لے کر۔ بازاروں، گلی کوچوں میں پھر اسکی آواز سنائی دی، عورتیں کھڑکیوں سے نکلیں۔

مال دید مبارک! مال دید مبارک!

امیرزادیاں اور آیائیں کھڑکیوں کی درازوں سے مال دید کو دیکھنے لگیں اور خوش ہو گئیں۔

جوں ہی وہ بازار میں پہنچی، ایک سرے سے دوسرے سرے تک شور اٹھا، ــــــ، مال دید آ گئی، مال دید مبارک!

مال دید کے آنے سے پھر سے بازار میں ایک نئی زندگی آ گئی، اور خالی پن دور ہو گیا۔

مال دید کہاں تھی؟ مال دید خیریت تھی؟

سب جانتے تھے کہ وہ کہاں تھی، وہ ساگ لے کر شہر کیوں نہیں آتی تھی؟ پھر بھی سب اس سے دریافت کرتے رہے کہ وہ کہاں تھی۔ مال دید

کے چہرے پر حیا کا سایہ تھا۔ وہ خود اپنی زبان سے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ کہاں تھی۔ کتنوں کے منہ بند کرتی۔ ایک طرف سلام لانگگر واس کا مذاق اڑا رہا تھا دوسری طرف سے حبیب دھنیا اسکو اکسا رہا تھا، وہ اپنی طرف سے ادھر ادھر کی کہہ کر ٹالنا چاہتی تھی مگر کب تک، قادر قصائی اب تک کسی خریدار کو گوشت دینے میں مصروف تھا مگر اب وہ بھی بول اٹھا۔

مال دید آج اور بھی جوان لگ رہی ہو۔

یہ سن کر مال دید کو اپنے پر اختیار نہیں رہا، وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دوسری سہاگ بیچنے والیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قادر قصائی سے کہا۔

ارے او، بیچارے خاموش ہو جاؤ، یہ تمہاری بیویاں پھر تم پر الزام دھرلیں گی۔

یہ سن کر سارا بازار زوردار قہقہوں سے گونج اٹھا مگر باقی ساگ بیچنے والیاں پھر ایک دوسرے سے کہتی تھیں،

دیکھ اس بے غیرت کو، اسے شرم نہیں آتی۔

ملبہ

حامدی کاشمیری

حامدی کاشمیری (۱۹۳۲ بہوری کدل، سرینگر) نے ۴۸۔۱۹۴۷ میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کشمیری زبان میں شعر لکھنے سے کیا ہے۔ لیکن وہ بعد میں اردو کی طرف آئے اور ۱۹۵۴ سے اردو میں ناول، افسانے، شاعری اور تنقید لکھتے رہے۔ ابتدائی دور میں انہوں نے چند ایک افسانے کشمیری زبان میں بھی لکھے ہیں۔ ''ملبہ'' ان ہی دنوں کا لکھا ایک مختصر افسانہ ہے۔ حامدی کاشمیری کے افسانوں میں کشمیر کا ماحول، سیاسی، سماجی ھالات، یہاں کے لوگوں کی بدحالی، حکمرانوں کا ظلم وجبر کے علاوہ انسانی نفسیات، ذہنی الجھنوں اور انسانی کمزوریوں کی تصویر ملتی ہے۔ ''ملبہ'' بھی انسانی کمزوری اور تنہائی کے درد کی عکاسی کرتا ہے انہوں نے اردو میں کوئی ۴۰ کتابیں لکھنے کے علاوہ کشمیری زبان میں بھی تنقید، افسانے، ریڈیائی ڈرامے، منظوم فیچرز لکھے ہیں اور ان کے دو شعری

مجموعے ''یتھ میانہ جوئے'' (اس میری جوئے بارمیں) اور
''نارس اتھ واس'' (آگ سے مصافحہ) چھپ گئے ہیں۔
ان کی ادبی حلقوں میں خوب پزیرائی ہوئی ہے۔

☆☆☆
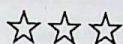
اس کی نینداڑ گئی تھی!

نصف شب کی خاموشی، بجلی کی ہلکی ہلکی روشنی، سائے، سایوں میں
سائے۔۔۔وہ کمرے میں اکیلی تھی۔ ''بھگوان جانتا ہے کہ وہ کب آیں
گے۔ان کے بغیر میں کیا ہوں، میری وقعت ہی کیا ہے۔ وہ میری جان
ہیں!'' ا۔۔۔سڑک کے اس پار شیشے کی کھڑکیوں کے اندر کمرہ روشن تھا۔
''کب آیں گے وہ؟ آیں گے بھی یا نہیں؟'' ۔۔۔وہ اٹھی اور الماری کی
طرف گئی، وہاں سے نیند کی گولیوں کی بوتل نکال لائی۔کھڑکی کے پورے
شیشے پر سیاہ پنجہ پھیلا ہوا تھا، جیسے وہیں پر جم گیا تھا

ٹھک ٹھک۔۔۔۔۔۔؟

وہ اٹھی اور شب خوابی کا پتلا لباس اچھی طرح جسم پر لپیٹ لیا۔ دروازہ کھل گیا، وہ نکلی اور ایک جست میں سڑک پار کر گئی۔ چاروں طرف منجمد ہوئے سائے دائیں بائیں ہو گئے، سرگوشیاں گونج اٹھیں۔ اس کا دل بلیوں اچھل پڑا۔ دروازہ کھل گیا، پہاڑ جیسا کہر آلود دروازہ۔۔۔

''مسز لتا؟''

''ہاں میں ہی ہوں''

وہ اندر گئی۔ مکان ویران اور اجاڑ تھا، خاموشیوں میں گھرا ہوا۔ سیڑھی کے زینوں پر فٹ فٹ گرد جم گئی تھی۔۔۔ اسکا دل دھک سے رہ گیا۔۔۔ بے چارہ۔۔۔ معصوم۔۔۔ وہ ایک دم کمرے میں گھس گئی۔ مہتابہ نے دروازہ بند کر لیا۔۔۔ اس نے خود ریشمی لباس اتار دیا اور ملگجی روشنی میں سفید بے داغ چادر کے اندر گھس گئی۔ برف جیسا سفید کفن پہننے کے باوجود وہ ساری رات شعلے کی طرح جلتی رہی۔

صبح اسکی آنکھ کھلی، وہ بستر سے اٹھ گئی۔۔۔ اور وہ بے خبر سویا تھا۔۔۔ اسکی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا جب اس نے دیکھا کہ دیوار کے ساتھ لگے پلنگ پر کوئی عورت ہے۔۔۔۔۔ نیند میں ہے۔۔۔ یا ۔۔۔ لاش۔۔۔ ہے بھگوان!!۔۔۔ مسز مہتہ۔۔۔ نہ نہ۔۔۔ مہتابہ۔۔۔ زونہ۔۔۔ شیلا۔۔۔ وہ خود۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں ابھی زندہ ہوں۔۔۔ صحیح و سلامت۔۔۔ کنول کی طرح پوتر۔۔۔ معلوم نہیں کون ہے۔۔۔

لاش۔۔۔پاگل پن۔۔۔ پولیس ۔۔۔شور مچاتی سرخیاں۔۔۔وہ جلد جلد نکلی اور سڑک پار کر دی۔۔۔سائے منجمد ہو گئے تھے۔۔۔سایوں کو چیر کے وہ قدم اٹھاتی رہی۔۔۔

یہ دیکھ کر وہ دہشت زدہ ہوگئی کہ اسکی بائیں پسلی کالے ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی اور ملبے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

ابھی تو رات ہے

ہری کرشن کول

ہری کرشن کول (۱۹۳۴ سرینگر) ۱۹۵۰ سے ہی اردو اور ہندی میں افسانے اور ڈرامے لکھے تھے۔ اور ۱۹۵۴ سے کشمیری میں لکھنا شروع کیا اور کشمیری زبان میں افسانے کی صنف کو انہوں نے استحکام بخشنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ''تاپھ'' (دھوپ) ریاستی کلچرل اکاڈمی کے کشمیری رسالے ''شیرازہ'' کے ''ازک کاشر افسانہ'' (آج کا کشمیری افسانہ) نمبر میں چھپ گیا، یہی پہلا افسانہ ایک کشمیری افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت کا باعث بن گیا۔ ہری کرشن کول نے کشمیر کی سماجی اور تمدنی زندگی کے حقیقی واقعات، حالات اور روایات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے لیکن ان کے افسانے خالص واقعاتی یا بیانیہ نہیں ہیں بلکہ کردار و واقعہ کی ڈرامائی صورت حال کے غماز ہیں۔ وہ افسانہ لکھتے وقت بلاشبہ تخلیقی ذہن سے کام لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کشمیر

پوری طرح جلوہ گر ہے وہ یہاں کے لوگوں کے مسائل، دکھ درد، مفلسی، آرزوں، ذہنی پریشانیوں، نفسیاتی الجھنوں اور یہاں کے موسمی حالات کوفنی صورت میں قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ کشمیری زبان میں ان کے تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے ہیں، ''پتھ لاران پربت'' (پربت پیچھے دوڑتا ہے)، ''حالس چھ روتل'' (ابھی تو رات ہے)، ''یتھ راز دانے'' (اس راج دھانی)۔

''حالس چھ روتل'' ان کا ایک مشہور افسانہ ہے۔ ❀

☆☆☆
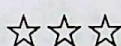
اف سردی، جیسے میں ماگھ کی کڑاکے کی سردی میں منجمد برف پر ننگے بدن سویا ہوا تھا۔ کمرہ بہت وسیع تھا اور اس میں ہم تین ہی تھے۔ کھڑکیاں بند تھیں مگر ان میں شیشے نہیں لگے تھے۔ باہر چھاجوں پانی برس رہا تھا اور پیر پنچال کے جھکڑ چل رہے تھے۔ بانہال کے یہ تیز ہوا کے جھونکے ٹورسٹ ہوسٹل کے اس کمرے میں بھی بھاگ دوڑ رہے تھے۔ اور کمرے میں ہوتے ہوئے بھی ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کمرے سے باہر سوے ہیں۔

بس میں ہمارے بستر ترپال کے ہوتے ہوئے بھی بارش سے بھیگ

گئے تھے۔ ہم نے چوکیدار سے کرایہ پر تین تین کمبل لئے، تھے۔ میں نے ایک کمبل ایک پٹڑے پر بچھا دیا تھا اور دو کمبل اوڑھ لئے تھے۔ مکھن نے بھی یہی کیا تھا۔ سوامی جی سوئے نہیں تھے۔ انہوں نے دو کمبل بچھا کے آسن بجایا تھا اور ایک ٹانگوں پر ڈال کے کوئی پوتھی پڑھ رہے تھے۔

ٹھنڈ میری ہڈیوں میں گھس گئی تھی۔ میرے شانوں، کمر اور پٹھوں میں درد ہو رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک عجیب بے قراری تھی۔ میں کروٹیں بدلتا رہا۔ مکھن میرے قریب ہی جسم سکیٹر کے سویا تھا۔ میں نے ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ کر کہا، ''میرے قریب آو، اکھٹے سو جائیں گے، شاید اسی طرح گرمی ہو جائے گی''۔

اس نے کندھوں سے میرا ہاتھ ہٹایا اور اپنا سر کمبل میں چھپا دیا۔ وہ مجھ سے ناراض تھا۔ دیکھا جائے تو اس کی ناراضگی بے وجہ نہ تھی۔ بانہال پہنچنے پر جب ڈرائیور نے کہا، ''اب رات یہیں پر گزارو تو مکھن ہی فرد واحد تھا جس نے اس کی مخالفت کی۔ ڈرائیور سے بہ اصرار کہا کہ وہ بس نکالے، آگے بڑھے، رات کو ہی سہی کسی ٹھکانے پر تو پہنچ جایں گے، مگر ڈرائیور ضد پر اڑا رہا۔ اگر ہم نے بھی مکھن کا ساتھ دیا ہوتا تو ممکن ہے کہ ڈرائیور بس نکالنے پر مجبور ہوا ہوتا مگر ہم خاموش رہے تھے۔ شاید ہم میں سے کئی سواریاں رات کے وقت بانہال پار کرنے میں خوف محسوس کر رہی تھیں۔ خاص کر جب پار لے جانے والا اس کے لئے راضی نہ تھا۔ مکھن نے

کافی دیر تک اس کے ساتھ بحث کی مگر ہار گیا اسکوڈرائیور سے اتنی ناراضگی نہ تھی جتنی ہم سواریوں سے اسے شکایت تھی۔

مجھے سونے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ میں اٹھا ہوا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سوامی جی کی طرف دیکھا وہ پوتھی کھول کے سامنے رکھکر کچھ سوچ رہے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' انھوں نے آنکھوں آنکھوں میں مجھ سے پوچھا۔

''سوامی جی بہت سردی ہے'' میں نے کہا

وہ تھوڑا مسکرائے۔ '' معلوم نہیں تم لوگوں کو کیوں اتنی ٹھنڈ لگتی ہے۔ مجھے تو نہیں لگتی۔''

''انکو ٹھنڈ کیوں لگے کی بھگوان نے انہیں اتنا موٹا تازہ بنایا ہے۔ چربی کے اندر ٹھنڈ نہیں لگتی۔'' مکھن نے اتنی آہستگی سے کہا کی صرف میں نے سنا۔ وہ سوامی جی سے زیادہ ہی چڑا ہوا تھا۔ رام بن میں سوامی جی بس سے اتر کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اور ہمارا آدھا گھنٹہ ضایع نہ ہوا ہوتا تو خونی نالہ کے پاس پسی گر آنے سے پہلے ہی ہم نے راستے کا خطرناک حصہ پار کیا ہوتا۔ اور اب تک ہم اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ہوتے۔ مکھن محسوس کرتا تھا کہ ہماری اس پریشانی کا باعث سوامی جی ہی ہیں۔ مگر دوسری بات بھی ہو گئی ہے جس کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سوامی جی کو الہام ہوا ہو کہ پسی گرنے والی ہے اسی لئے انہوں

نے رام بن میں آدھا گھنٹا روکے رکھا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا ہوتا تو ممکن ہے ہماری بس بھی پسی کے ساتھ لڑھک گئی ہوتی۔ کیا کہا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں جو بھگوان کرتا ہے وہ اچھا ہی ہوتا ہے۔

میں نے پھر دو کمبل اوڑھے اور سونے کی کوشش کی لیکن نیند کہاں، کندھوں اور پٹھے کا درد شدید ہوگیا۔ اور میری بے قراری مزید بڑھ گئی سردی سے انگ انگ اکڑ گیا۔ ادھر سے دل میں عجیب واہمے نے جگہ کرلی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ایک پہاڑ کو لڑھکتے دیکھا تھا۔ خونی نالہ کے پاس آدھی پسی پہلے ہی گر آئی تھی۔ ہم وہیں پر کھڑے باتیں کررہے تھے کہ اوپر سے کچھ چھوٹے پتھر گرے ہم نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی لیکن ہم یہ دیکھکر خوف زدہ ہوے کہ اس پتھریلے پہاڑ میں جو باریک شگاف پڑنے لگے تھے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے بڑھنے لگے۔ پھر ایک ہیتناک گرج کے ساتھ پورا پہاڑ گرنے لگا۔ ہماری چیخ نکل گئی اور پیچھے کی طرف بھاگ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ پہاڑ کا ایک ایک حصہ آبشار کی صورت گرتا اور نیچے غائب ہوجاتا۔ بڑے بڑے چٹان پاش پاش ہوگئے۔ مٹی اور چٹانوں کے ساتھ پورے دیودار کے درخت جڑ سے اکھڑ کے لڑھکتے گئے۔ یہ دیکھکر میرے دل میں ایک عجیب واہمہ گھر کر گیا۔ اور ابھی تک رفع نہیں ہوا تھا۔ راستہ چھ گھنٹے بعد کھل گیا لیکن ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ جو ابھی تک تھمی نہیں بلکہ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی ہے۔

میں نے کروٹ بدلی اور دونوں ہاتھ گھٹنوں کے بیچ میں رکھکر گھٹنے پیٹ میں گھسا دیئے۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی اور برفیلی ہوائیں اس ٹورسٹ ہوٹل کے کمرے میں ایک طرف سے آتیں اور دوسری طرف سے نکل جاتیں ہیں مجھے احساس ہوا کہ وہ سواریاں اچھی رہیں جو بس کے اندر ہی ٹھہر سکیں۔

اچانک بجلی چلی گئی اور میری گھبراہٹ دوچند ہوگئی چاروں طرف سے عجیب خوف محسوس ہوا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا سوامی جی کے پاس چلا گیا۔

''سوامی جی یہ ٹھنڈ، یہ اندھیرا، یہ بارش، اور یہ طوفان، کہیں ہم یہیں جم کے پتھر نہ بن جائیں! ہماری موت ایسے ہی تو نہیں لکھی گئی ہے''!! میں نے قریباً روتے ہوئے کہا۔

انہوں نے اپنی پوتھی بند کی اور جھولے میں رکھ دی۔ اس میں سے موم بتی کا ایک ٹکڑا نکالا اور جلایا کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی اور دیواروں پر ہمارے سائے پھیل گئے۔ ہوا سے موم بتی کی لو ہلتی اور ہمارے سائے بھی تھرتھرا اٹھتے۔ سوامی جی نے میرے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور کہا ''ڈرتے کس سے ہو؟ یہ سب جھوٹ ہے۔''

''کیا جھوٹ ہے؟'' میں نے ان کی بات نہ سمجھی

یہ رات یہ اندھیرا یہ سردی یہ سب ایک سپنا ہے''

''مگر مجھے یہ سب سچ لگتا ہے'' میں سچ مچ حیران ہو گیا

''سچ لگنے سے کیا ہوتا ہے'' سوامی جی ہنسے ''کیا سپنے میں سب کچھ سچ نہیں لگتا؟''

''ہاں لگتا تو ہے'' میں نے سر ہلا کر اقرار کیا

''اسی طرح یہ کمرہ، بغیر شیشوں کے یہ کھڑکیاں، یہ بارش یہ برفیلی ہوا سپن مایا ہے۔صبح جاگ جاوگے، نہ کہیں یہ پہاڑ ہونگے، نہ یہ سفر، نہ یہ ساتھی''

وہ اٹھے پاوں میں گرگابی پہنی، دروازہ کھولا اور شاید پیشاب کرنے باہر گئے۔ میں بھی اٹھا اور اپنی جگہ پر واپس آیا۔سوامی جی کی باتوں سے مجھے بڑی تسلی ہوئی اور آہستہ آہستہ خوف میرے دل سے نکلنے لگا۔دراصل خوف انسان کے اردگرد نہیں ہوتا بلکہ اس کے من میں ہوتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے من کو مضبوط رکھیں۔

میں اسی سوچ میں تھا کہ مکھن نے کمبل میں سے اپنا سر باہر نکالا اور پوچھا '' کیا کہہ رہے تھے۔یہ سب خواب ہے؟'' میں نے اقرار کیا۔''پوچھنا تھا یہ خواب کون دیکھ رہا ہے۔وہ؟ تم؟ یا ہم سب ایک ساتھ، ایک مشترکہ خواب۔''

اس نے پھر سے پاوں تک کمبل اوڑھ لیا اور سو گیا۔میں پھر اکیلا ہو گیا، اور اسی وقت ہوا کے تیز جھونکے نے موم بتی بجھا دی اور میرے دل میں وہمہ پھر ابھر آیا، پہاڑ گر آنے کا ہیبتناک منظر پھر آنکھوں کے سامنے

آ گیا۔ میں نے بھی سر سے پاوں تک کمبل اوڑھ لیا اور لیٹ گیا۔ لیکن بے قراری میں نیند کہاں ۔ میں پھر اٹھ گیا اور سگرٹ جلایا۔

کاش یہ واقعی خواب ہوتا، میں سوچنے لگا۔ مگر ''خواب ہوتا'' کیا معنی؟ یہ تو واقعی خواب ہے۔ سوامی جی نے کچھ غلط نہیں کہا۔ یہ سپن مایا نہیں تو اور کیا ہے۔ اسی سوامی جی اور مکھن کو لو۔ آج سے پہلے میں ان کو جانتا کب تھا۔ مگر اس وقت میرا اسنسار ان ہی میں سمیٹ کے رہ گیا ہے۔ کل جب میں گھر پہنچ جاونگا یا بقول سوامی جی جاگ جاونگا، ان کا وجود کہاں ہوگا؟

جلتی سگرٹ میرے دائیں بازو کو لگی، مجھے جلن کا احساس ہوا، لیکن احساس ہونے سے کیا ہوا، کچھ بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آبی پر خشکی اور خشکی پر آبی کا گمان ہوسکتا ہے۔ جو محسوس ہوتا ہے ضروری نہیں کہ وہ حقیقت ہی ہو۔ میں نے مکھن کو ٹہوکا دیا، وہ اٹھ بیٹھا۔ میں نے اس سے کہا'' مکھن تم مجھے بتا سکتے ہو کہ حقیقت کیا ہے؟

'' حقیقت یہ ہے کہ ہم بھیڑیں ہیں'' جیسے اس کے پاس اس سوال کا جواب پہلے سے موجود تھا۔ '' معلوم ہے کہ ڈرائیور کیوں رات کو یہاں رک گیا؟ اس کو ہالٹیج مل جائے گی۔ وہ پیسے کمائے گا، ہم سردی سے اکڑ جایں گے، اسے کیا۔ اس کو اپنے پیسوں سے مطلب ہے، وہ عیش کرے گا مگر افسوس، ہم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکے۔''

'' ہوسکتا ہے یہ سارا خواب ہو، اس کے بارے میں تم کیا کہو گے''

مگر جیسے اس کے پاس اس سوال کا جواب بھی تیار تھا، اس نے کہا، ''خواب ہی سہی، اگر ہم متحد ہو کر ڈرائیور کو بس نکالنے پر مجبور کرتے، اس وقت ہم اپنے اپنے گھروں میں گرم گرم بستروں میں آرام کرتے ہوتے۔ یہ خواب ہمارے لئے اسقدر کھٹن نہ بنا ہوتا۔''

میں اور زیادہ حیران ہوگیا۔ ممکن ہے اسی کی بات صحیح ہو کہ ہم بھیڑیں ہیں۔ یا ممکن ہے کہ سوامی جی کا کہنا ہی سچ ہو کہ یہ سارا خواب ہے جب ہم صبح جاگ جائیں گے تو نہ یہ پہاڑ ہونگے، نہ یہ بارش، نہ یہ تیز ہوا، نہ یہ سردی ہوگی۔ مگر صبح ہونے تک ابھی بہت وقت ہے۔ ابھی تو رات ہے، ابھی تو اندھیرا ہے، ابھی تو سردی ہے۔ اس تاریکی میں، اس سردی میں، میں اکیلے پن کا شکار رہوں۔ ان دونوں میں سے ایک سرتاپا کمبل لے کر روٹھا بیٹھا ہے اور دوسرے کو سردی لگتی ہی نہیں۔ وہ ابھی تک اندر نہیں آئے۔

پلیٹ فارم کے اس پار

ہردے کول بھارتی

ہردے کول بھارتی (۱۹۳۷ کولگام کاکرن) نے ۱۹۶۰ کے بعد لکھنا شروع کیا وہ بھی اس وقت کے دوسرے کشمیری ادیبوں شاعروں کی طرح اردو اور ہندی میں لکھتے تھے وہ کئی زبانیں جانتے ہیں۔ ہندی، اردو، کشمیری، فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی، ڈوگری وغیرہ اور ہندی، اردو، کشمیری اور انگریزی میں لکھتے ہیں اور ترجمے کرتے ہیں۔ انہوں نے کئی کشمیری شاعروں کے کلام کو اردو اور انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ اخباروں کے ساتھ بھی وابستہ رہے ہیں۔

ہردے کول بھارتی نے اس وقت کشمیری میں افسانے لکھے جب یہاں کے ادیب وشاعر جدیدیت سے متاثر تھے۔ اس بات پر کشمیری ادب کے نقاد متفق نظر آتے ہیں کہ کشمیری زبان کے افسانہ نگاروں میں ہردے کول بھارتی نے سب سے زیادہ تجریدی اور علامتی افسانے لکھے ہیں۔ وہ کردار

کے اندرون سے پردہ ہٹاتے ہیں، انھوں نے ہندو دیو مالا سے بھی استفادہ کیا ہے۔لیکن وہ حقیقی حالات سے چشم پوشی نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے یہاں حقیقت اور خواب کا امتزاج ہے۔ ''ہمزاد''، ''انہٕ گٹہٕ چہٕ ٹوپاز کھنجہٕ'' (اندھیرے کے ٹوپاز ٹکڑے) ''آبنوسکِ رولر جگرِچ مِش'' (آبنوس کا رولر جگر کی پھانس) اور ''پلیٹ فارم اپارٕ'' (پلیٹ فارم کے اس پار) اس کی مثالیں ہیں۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ژکرو یہ ہے۔

☆☆☆

پلیٹ فارم خالی تھا، ایک ٹرین نکل چکی تھی دوسری ابھی پلیٹ فارم پر لگی نہیں تھی۔ یہ میں نے دور سے ہی جنگلے کے اس طرف سے دیکھا۔ٹکٹ گھر کے سامنے بھی زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ یا تو لوگ گھر جانا بھول گئے تھے یا وہ جلدی آکر پہلی ٹرین سے اپنے اپنے گھروں کو پہنچ گئے تھے۔

پہلی ٹرین کے مس (miss) ہونے کا مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوا بلکہ میں خوش ہوا۔اس لئے کہ دوسری ٹرین میں رش کم ہوگا۔ٹکٹ گھر کی کھڑکی کھلی تھی اور ٹکٹ دینے والا بھی اندر کسی جگہ چھپا ہوا بیٹھا تھا۔کھڑکی

کے سوراخ میں سے صرف اس کے ہاتھ نظر آرہے تھے۔ بظاہر ان ہاتھوں میں ایسا کچھ نہیں تھا جس کو غیر معمولی کہا جاتا، نہ رنگ نہ ہی بناوٹ کے طور پر۔ پر معلوم نہیں مجھے کیوں ہاتھوں میں سحر سا محسوس ہوا جیسے یہ مرضی کے مطابق یا ضرورتاً چھوٹے یا بڑے ہو جاتے ہوں گے یا ان میں نرمی یا سختی آجاتی ہوگی۔ جیسے ان ہاتھوں میں بیک وقت مسیح کی شفا اور فرعون کا ظلم تھا۔ ان ہاتھوں کو دیکھ کر میرے دل میں وہم سا ہو گیا۔ ٹکٹ گھر تک جانے کی مجھ مین ہمت نہ ہوئی۔ لیکن ٹرین میں بیٹھنے کے لئے ٹکٹ لانا ضروری تھا اور ٹکٹ لانے کے لئے ٹکٹ گھر تک جانا ضروری تھا، میں نے کمال جرات سے کام لیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا اور پیسے مُٹھی میں لئے، سر کو جھکا کر میں ٹکٹ گھر ۔ تک پہنچ گیا، مشکل سے ہاتھ کھڑکی کے سراخ تک لے گیا اور اس کے ہاتھوں کے قریب مُٹھی کھولی، زبان سے کچھ نہ بول سکا، مجھے یہ لمحہ ایک عمر کے برابر لگا، سچ تو یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ جیسے فلیشز (flashes) میں ہو رہا تھا، برق رفتاری کے ساتھ، مگر ایسے ہوتے ہوئے بھی نہ وقت بچا اور نہ ''ہونا'' (happening) ہی کم ہوا، جیسے وقت اور ''ہونا'' (واقعہ) ایک دوسرے کے قالب سے نکالے گئے تھے۔

اس کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی۔ ایک ہاتھ دوسرے سے الگ ہو گیا۔ اور جیسے پھیل کر آرام سے میرے ہاتھ پر بیٹھ گیا۔ جس میں ٹکٹ کے پیسے پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ مجھے لگا جیسے میرے ہاتھ میں دل رکھ دیا گیا

ہو۔ ویسا ہی پیار، ویسی ہی دھڑکن، ویسی ہی ٹھنڈک، میں نے چاہا کہ وہ
ہاتھ اب تک میرے ہاتھ پر رہے۔ مگر وہ نہیں ہوا۔ اس نے آہستہ اپنا
ہاتھ اٹھایا اور پھر اسی طرح اپنے دوسرے ہاتھ پر رکھ دیا جس طرح میں نے
اس کو دیکھا تھا۔ ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں اٹھائے اور نہ ہی ٹکٹ دیا، میں سمجھا کہ
شاید ٹکٹ کے لئے وہ پیسے کم ہیں اسلئے میں نے مُٹھی بند کر کے ہاتھ واپس نکالا
اور جیب میں ڈال دیا، وہاں سے پورے دن کی کمائی نکالی اور اس کے
سامنے رکھ دی۔۔۔ انتظار کیا وہ پھر دل جیسا ہاتھ اٹھا کر میرے ہاتھ پر رکھ
دے گا مگر اس کے ہاتھ میں حرکت نہ ہوئی، مجھے جیسے شکنجے میں کس دیا گیا،
اور محسوس ہوا کہ انتظار کرتے کرتے میں بہت تھک گیا ہوں، حالانکہ مجھے
آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی، میں تھکاوٹ کے احساس سے کھڑکی
کے ساتھ کہنی ٹکا کے سہارا لینے ہی لگا تھا کہ اندر سے آواز آئی "یہاں
ریزرویشن (reservation) کے بغیر ٹکٹ نہیں ملتا"
آواز کے ہر لفظ کے ساتھ ہی اس کی انگلیوں کے آخری
پوروں (صرف انگلیوں کے آخری پوروں) میں اس طرح حرکت ہوئی جیسے
یہ آواز ان ہی میں سے نکل رہی تھی، اس کے بعد خاموشی چھا گئی، مکمل
خاموشی اور اس کی انگلیوں کی حرکت بھی بند ہوگئی، میں نے اس کے کہنے کو حکم
مان کر بنڈل سے ایک ریزرویشن فارم اٹھایا اور ٹکٹ گھر سے باہر آ گیا۔
باہر ایسی دھوپ تھی کہ ہر سایہ الٹا پڑتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں مشکل

سے جنگلے تک پہنچ گیا تھا کہ وہ میرے سامنے آ گیا، ایسے جیسے وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ چہرے سے اس کی ہئیت معمولی سی تھی، معمولی اس حساب سے کہ اس کے چہرے میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس سے وہ یاد رہ جائے، ایسا وجود جو چار کے جمگھٹے میں بھی کھو جاتا۔ اکثر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں اس لئے مجھے اسے دیکھ کر حیرانی بھی نہیں ہوئی۔ اس نے کچھ کہے بغیر ہی اپنے ہاتھ کا قلم میری طرف بڑھا دیا اور میں نے کچھ کہے بغیر ہی اس کا قلم لے لیا اور فارم بھرنے بیٹھ گیا۔۔۔ نام۔۔۔ ہردے کول بھارتی، منزل۔ گھر۔۔۔۔

فارم بھرنے کے بعد میں نے اس کو قلم واپس دینا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر واپس لینے سے انکار کیا کہ یہ اس کا قلم نہیں ہے۔ میں نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی

''آپ نے ابھی یہ قلم مجھے دیا نا؟''

''نہیں۔ اگر میرا ہوتا تو کیا میں نہ لیتا'' اس نے حجّت کی،

میں نے پھر بہ اصرار کہا'' دیکھئے یہ آپ ہی کا قلم ہے۔ یہاں تو میرے اور آپ کے سوا آس پاس اور کوئی نہیں ہے''

''نہیں ہوگا کوئی، مگر یہ قلم میرا نہیں ہے'' کہتے کہتے وہ پیچھے مڑ گیا اور اندر پلیٹ فارم کی طرف چلا گیا، میں حیرت زدہ اس کو دیکھتا رہ گیا۔

دور ٹرین کی چیخ گونجی، شاید پلیٹ فارم پر ٹرین لگنے والی تھی، جی

میں آیا کہ دوڑ کے پلیٹ فارم پر پہنچ جاؤں تاکہ ٹرین مس نہ ہو جائے، لیکن ٹانگیں چلنے کو تیار نہ تھیں اس قلم کا کیا کروں؟ --جب تک اس قلم کا وارث نہیں آتا، میں کہاں جا سکتا ہوں؟ کسی کی امانت لیکر میں جا بھی نہیں سکتا! یہ بوجھ لیکر سفر کرنا ناممکن تھا۔ اس نے جھوٹ کہا۔ نہیں تو یہ قلم اسی کا تھا۔

ٹرین نے پھر چیخ ماری۔ --شاید نکلنے کی تیاری میں تھی، میں نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا، اس قلم کا کوئی تو مالک ملے گا مگر سب میری طرف اچٹتی ہوئی بے معنی سی نظریں ڈال کر پلیٹ فارم کی طرف بھاگ رہے تھے۔ سب کو ایک ہی فکر تھی، ٹرین میں سوار ہونے کی۔ --ٹرین نے تیسری اور آخری چیخ دی اور انجن چلنے لگا، چُھک چُھک کرتے ہوئے۔ منزل کی طرف۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں بازی ہار گیا۔ کونسا شراپ لگ گیا جو یہ قلم بوجھ بن گیا۔ --شرمندہ ہوکر میں نے دور سے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سوراخ کی طرف نظر ڈالی، اسکے ہاتھ ابھی بھی اسی حالت میں تھے اور وہ اندر کسی جگہ پوشیدہ بیٹھا تھا، اسکے ہاتھوں کی انگلیوں کے پوروں (صرف آخری پوروں) میں پھر حرکت ہوئی۔ --

''اس نے جھوٹ نہیں کہا، یہ قلم اس کا نہیں تھا''

''پھر کس کا''؟ میں نے جیسے خود سے سوال کیا۔

اس کی انگلیوں کی پوروں میں پھر حرکت ہوئی۔ --''معلوم نہیں کس کا۔ اس نے بھی یہ اسی طرح لیا تھا، کسی نے کسی سے لے لیا اور فارم بھر

دیا۔اس سے کسی اور نے لیا، اس سے کسی اور نے، اوراس سے کسی اور نے، اُس سے اس نے اوراس سے تم نے اور فارم بھرلیا۔''

بات ختم ہوئی اور میں کھویا ہوا ان ہاتھوں کو دیکھنے لگا، اس کے بعد معلوم نہیں کتنی دیر تک خاموشی رہی۔۔۔ مجھے تھکاوٹ کا شدید احساس ہوگیا، قلم اب بھی اسی طرح میری انگلیوں میں تھا۔

''تھک گئے ہو'' اس نے کہا، لیکن میں نے ٹکٹ گھر کی طرف نظریں نہیں اٹھائیں۔اس کے بعد پھر معلوم نہیں کتنی دیر تک خاموشی چھا گئی، قلم اب بھی اسی طرح میری انگلیوں میں تھا۔

''تم وہیں پر جنگلے کے ساتھ ٹیک لگا کر نیچے بیٹھ جاؤ۔تھکاوٹ کا احساس کم ہوجائے گا''

اس کی بات حکم مان کر میں نیچے بیٹھ گیا، جنگلے کے ساتھ ٹیک لگائی۔مگراس وقت بھی نظریں ٹکٹ گھر کی طرف نہیں اٹھائیں۔

''راستہ ایک ہی ہے'' وہ پھر کہنے لگا اور یہ جان کر کہ وہ کوئی چارۂ کار بتائے گا میں نے ٹکٹ گھر کی طرف جھٹ سے نظر اٹھائی۔انگلیوں کے آخری پوروں میں برابر حرکت ہورہی تھی۔

''تم اسی جگہ بیٹھ کر لوگوں کو ریزرویشن فارم پُر کرکے دیا کرو۔ہوسکتا ہے کہ ایک دن اس قلم کا وارث تمہارے پاس فارم بھرنے آئے گا اور تم کو آزاد کریگا''۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی اور ساتھ ہی انگلیوں کے پوروں کی حرکت بند ہوگئی اور جب سے میں برابر لوگوں کے فارم پُر کرتا رہا ہوں، کتنی ہی ٹرینیں آئیں اور گئیں، کتنے ہی لوگ منزل پر پہنچ گئے، کتنے کتنے اور کیسے کیسے لوگوں کے فارم میں نے بھر دئے لیکن قلم کا وارث نہیں آیا۔ معلوم نہیں کبھی آئے گا بھی یا نہیں۔ اب مجھے تھکاوٹ کا احساس شدید تر ہو گیا ہے۔۔۔ شاید میں واقعی بہت تھک گیا ہوں۔۔۔ ٹکٹ گھر کے دو ہاتھ بھی پتہ نہیں کہاں چھپ گئے اور کھڑکی بند ہے۔

پہلا سبق

رتن لال شانت

❁رتن لال شانت (۱۹۳۸ بڈی یار بالا، سرینگر)
۱۹۵۲ سے ہی ہندی میں افسانہ لکھ رہے ہیں۔ وہ ہندی اور اردو
میں ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔ انہوں نے ترجمے بھی کئے ہیں۔ لل
دید، شیخ العالم اور رسول میر اور دینا ناتھ نادم کا کلام ہندی میں
ترجمہ کیا ہے۔ تنقیدی اور تحقیقی کام بھی انجام دیا ہے۔ ''کاشر
افسانہ ازتہ پگاہ'' (کشمیری افسانہ: آج اور کل) اور ''کاشر نثرچ
کتاب'' (کشمیری نثر کی کتاب) ان کی دو اہم تنقیدی کتابیں ہیں
ان کے کشمیری افسانوی کا ایک مجموعہ ''اچھروالن پیٹھ کوہ'' (پلکوں
پر کوہ) شائع ہوا ہے۔ رتن لال شانت خارجی حقیقت نگاری کو
افسانوں میں پیش کرنے کے حق میں ہیں۔ واقعات، ان کا پس
منظر اور کردار کی ذہنی کشمکش ان کے افسانوں کی جان ہے۔ ان
کے یہاں انسانی نفسیات اور فطرت کے تجزیے بھی ملتے ہیں۔
''ژھایہ گتی'' (سایوں کا رقص)، ''ترکونجل'' (تکونی) ''گوڈنک
سبق'' (پہلا سبق) ان کے مشہور افسانے ہیں۔ ❁

جوں ہی اس نے گاؤں کے اندر پہلا قدم رکھا، اس کی نظر اپنی گھڑی پر پڑی، اس نے قدم روک لئے، بائیں ہاتھ سے اس نے شانوں کو کھجلایا، کمر پسینے سے شرابور ہوگئی تھی، جوتے اور پتلون کو جھاڑا، گرد کی تہہ ان پر جم گئی تھی، اسے نہ جانے کتنے گھنٹے چلتے ہوئے بیت گئے تھے۔ پیچھے کی طرف تھکی ہوئی مگر تیز نظر ڈالی بہت دور اور نیچے تک اس نے متجس نظر دوڑائی اور سڑک کو ڈھونڈ نکالا، صبح کی دھند اور گرد وغبار کے نیلے دھویں میں جیسے پامال سانپ کی کینچلی، معلوم نہیں کتنا وقت گزرا جب سے اس نے اس سڑک کو طے کیا، پہاڑ کے دامن میں گھاس کی جھاڑیوں، کھیتوں اور نالوں میں سے گزرتے ہوئے وہ تھکے ہارے قدم اٹھاتا رہا، ویران کھیتوں کی گرد کو پاؤں سے روندھے ہوئے صرف ایک ہی ارادہ اس کے دل میں پل رہا تھا کہ ایک تو وہ اس اجاڑ اور پچھڑے ہوئے علاقے کو روشن کرے گا اور دوسرے اس میں ایک نئی امید جگائے گا۔ اس نے سوچا کہ اب تک وہ ادھر ادھر بھٹکتا رہا اور اب شاید صحیح مقام پر پہنچ جائے گا۔ وہ چلتا رہا، آہستہ آہستہ اس کے قدم ہموار ہوئے اور اس نے سوچا کہ دوپہر تک جوئن ''join'' کرلے گا، آج کا دن بھی مجرا ہوگا۔

وہ پھر چلتا رہا، دور اسے کوئی آدمی اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے ادھر ہی سے سلام کیا۔ اور پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، ''آپ ہی کا انتظار تھا'' اس کے لمبے لمبے قدموں کے ساتھ وہ بھی اپنی تھکی ٹانگیں گھسیٹتا گیا۔

وہ دونوں ایک گھاس کی چھت والی پست جھونپڑی کے اندر گئے، جس کمرے کے اندر وہ گئے وہاں اماوس کی رات کی تاریکی تھی وہاں کوئی تیس آدمی اس بند کمرے میں ایک تابوت کے اردگرد بیٹھے تھے، وہ دم بخود تھے، وہ غیر محسوس طریقے سے اندر گیا، اور تابوت کے پاس بیٹھ گیا، صرف وہی جگہ خالی تھی، کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا، کسی نے اس سے کچھ نہ کہا، سانس کی آمدوشد کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی، وہ سمٹ سمٹا کر بیٹھ گیا، وہ اتنا سمٹ گیا کہ اس کا ہاتھ معاً تابوت کو چھو گیا اور اچانک اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی، معلوم نہیں کب تک ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ؟

جونہی اس کا گلہ سوکھ گیا اور سر چکرانے لگا وہ خاموش ہو گیا، آنکھیں ملیں، دیکھا کہ کمرے میں اب کوئی نہیں تھا، وہ کھڑا ہو گیا اور باہر نکلا، شام کی سیاہی پھیلنے لگی تھی، چاروں طرف نظر دوڑائی، کہیں کوئی نظر نہیں آیا، جیسے پورا گاؤں اجڑ گیا تھا، نہ آدم نہ آدم زاد، آخر یہ سب کہاں گئے؟ وہ کچھ دیر رکا، سر کو ہلایا، جو رونے سے خالی ہو گیا تھا، جھنجھنے کی طرح بج رہا تھا، وہ گاؤں سے باہر آیا تو اسے دور سے کسی کا ہیولا نظر آیا، اس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا، جب اس نے ادھر ہی سے سلام کیا، صبح کی طرح تو اس نے اسے روکا، سوچا دن تو نکل گیا، اب کل صبح ہی کام ہونا چاہیئے، اس نے اسے سے پوچھا "بابا

یہاں سکول کہاں ہے مجھے وہاں جوئن کرنا تھا''۔

ماشٹر صاب اب یہاں سکول کہاں؟ آخر پڑھنے کی عمر کا کوئی بچہ وچہ تو ہونا چاہیئے نا؟ یہی کوئی چھ سال ہوئے ہونگے، جب اس پہاڑ کا پیر صاب گاؤں کے لوگوں سے خفا ہو گیا۔۔۔۔۔آپ خود دیکھیئے، اگر گاؤں میں بارہ پندرہ سال سے کم کا کوئی لڑکا نظر آئے۔۔۔۔۔!

یہ کہتے ہوئے وہ کافی دیر تک ''ہاہاہا'' کرتا رہا۔۔۔۔صبح کا یہ انجان انسان کتنا عجیب تھا، کچھ دیر تک اس نے کلام جاری رکھا'' ہاں یہ مگر صاب کا بڑا اپن ہے کہ چار پانچ سال کے بعد جب وہ یہاں آتا ہے تو کہتا ہے کہ سکول دلوا دے گا، ہونا ہی چاہیئے تھا ماشٹر صاب مگر ڈاکٹر؟ دیکھیئے اگر یہاں ڈاکٹر ہوتا تو حاجی صاحب کا بیمار اکلوتا بیٹا نہ مرجاتا۔۔۔۔۔آپ ہی ذرا سوچو ماشٹر صاحب۔۔۔۔ماشٹر صاب''۔

صبح سویرے جب اسکو لگا کہ اس کی گردن اکڑ گئی ہے اور ٹانگوں میں چونٹیاں سی رینگ رہی ہیں تو سمجھ گیا کہ وہیں گھاس کے ڈھیر پر اسے نیند آگئی تھی۔ نہ جانے وہ آدمی کتنی دیر تک بولتا رہا۔

خوشگوار ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے اس میں تازگی سی آگئی، صبح کی ملگجی روشنی میں اس نے گاؤں پر نظر ڈالی، ایک پوری جماعت، مدرسہ! مست نیند میں گھاس کی چھت والی جھونپڑیاں، گھاس کے ڈھیر، شالی کے بورے، پیڑ پودے۔۔۔۔

وہ کھڑا ہو گیا، انگڑائی لی، تو ادھر کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں بولنے لگا۔۔۔۔ ''آج میں تم کو یہ بتاونگا کہ ہماری یہ زمین چپٹی نہیں بلکہ گول ہے، خربوزے کی مانند، سورج ایک ہی جگہ ٹھہرا ہوا ہے اور ہماری زمین محور پر سورج کے اردگرد چکر لگاتی ہے، گھومتی ہے۔ تم تجربہ کرو، ایک فٹ بال لاؤ اس کو چراغ کی روشنی کے سامنے رکھو اس کا ایک حصہ روشن رہے گا اور دوسرا حصہ تاریک، یعنی اندھیرا، اسی طرح ہمارے دن رات بنتے ہیں، بس اسی طرح، اسی وجہ سے موسموں کا تغیر ہوتا ہے، سمجھ میں آیا؟ شاباش!۔۔۔۔۔ اسی طرح اگر ہمارے یہ کھیت، یہ نالے، کھانے کے لئے فصل، پینے کے لئے پانی۔۔۔۔ اچھا بتاؤ پہاڑوں کے فائدے۔۔۔۔۔!

دھوپ اب سیدھے اس کی آنکھوں پر پڑنے لگی، تو ذرا دیر کے لئے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔۔۔۔۔

صبح کے قہر آلود دھویں میں سڑک صاف نظر آرہی تھی۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔۔۔ نیچے۔

ایک احساس یہ بھی

بنسی نردوش

﴿بنسی نردوش (۱۹۳۹۔۲۰۰۲ گنپت یار سرینگر) ۱۹۶۰ کے بعد کے کشمیری افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔انہوں نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔وہ ایک صحافی کی حیثیت سے کئی اخباروں،شیرِ پنجاب (امرتسر)، خدمت (سرینگر)، نیازمانہ (جالندھر) کے ساتھ کافی عرصے تک وابستہ رہے ہیں۔تین افسانوی مجموعے''بال مرایو'' (محبوبہ مرجاونگی)،''آدم چھ یتھے بدنام'' (آدم یوں ہی بدنام ہے)اور''گرداب'' اور ایک ناول ''اکھ دور'' (ایک دور)، ان کی تصنیفات ہیں۔ان کے افسانے انسان دوستی اور کشمیری عوام کے سماجی مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں،وہ خاص طور سے کشمیری پنڈتوں کی تہذیبی اور گھریلو زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں وہ انسانی احساسات وجذبات کی پوری

فنکاری کے ساتھ عکاسی کرتے ہوئے اپنے کرداروں کے دکھ سکھ میں شریک رہتے ہیں۔ان کے افسانے اکثر حیران کن اختتامیہ پر منتج ہوتے ہیں۔"یہ تہہ اک احساس" (یہ بھی ایک احساس) ان کا ایک نمائندہ افسانہ ہے۔

☆☆☆
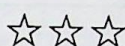
یوں تو اسے نہ کہیں درد تھا نہ کوئی تکلیف، لیکن اسکی درد بھری آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ بملا اندر کسی درد کو سہار رہی تھی، اس کا مٹیالا چہرہ کچھ کہنا چاہتا تھا، جو میری سمجھ سے بالاتر تھا، اگر کہیں کہ اسے مجھ سے کوئی رنجش تھی، وہ بھی نہیں تھی، ہم دونوں میاں بیوی کو ویسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی، اگرچہ گھر کی دیواریں سونے کی بنی نہیں تھیں لیکن ایک کھاتا پیتا گھر تھا، متوسط طبقے کا گھر۔ جو ایک عورت کے پاس ہونا چاہئے تھا اس کو بھی میسر تھا، اہم بات تو خاوند کی طرف سے چاہت ہے، تو میں اسے جی جان سے چاہتا تھا، اگر بیوی کے پاس بیٹھے رہنے کی بھی تنخواہ ملتی تو میں اس کے پاس بیٹھے رہنے سے کبھی نہ تھکتا۔ جب میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھکر ہی جی رہے ہوں تو زندگی پونم چاند کی طرح نہ لگے تو اور کیا لگے۔

اس ہنستی اور کھیلتی ہوئی فضا میں جب میں کبھی کبھی بملا کو دل گرفتہ دیکھتا تو میں اندر سے گھبرا اٹھتا، سوچتا تھا اس سے پوچھوں کہ "تمہیں کیا ہو گیا

ہے''، مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا تھا کہ کہیں میری بات اسکی آگ کو اور نہ بھڑ کائے اور بے قرار کرے، کبھی بیٹھے بٹھائے اس کا دھیان نہ معلوم کدھر جاتا اور وہ کچھ دیر کے لئے اسی میں کھو جاتی اور میرے ٹہوکا دینے پر اس کے ہونٹوں پر مسکان کی لکیر سی جاگ جاتی اور میری زبان پر آئی ہوئی بات رہ جاتی۔

میں ترستا رہا لیکن اس راز سے پردہ نہ اٹھا۔ موقع محل ہو یا نہ ہو میں کسی نہ کسی طرح اس سے بات کہلوانا چاہتا تھا، لیکن ہر بار وہ ٹال جاتی تھی، تھی بھی یہ حیرانگی کی بات، میں سوچتا تھا کہ جب وہ کبھی جوش میں آکر خوب خوب باتیں کرتی ہے تو کبھی اچانک اسکو چپ کیوں لگ جاتی ہے، جیسے اسکو کوئی بھولی ہوئی بات یاد آئی ہو۔

جب بھی میں نے اس سے اسکی وجہ پوچھی، اس نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا'' آپ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں نا؟ اس لئے آپ ناحق فکر مند ہو جاتے ہیں۔ میں تو اچھی بھلی ہوں، مجھے ہوا کیا ہے۔''

یہ بھی جھوٹ ہی تھا، اب اسکی ایک بات بھی میرے گلے سے نہیں اترتی تھی، دل گواہی دیتا تھا کہ یہ مجھے بیوقوف بناتی ہے، اور سچ نہیں بولتی، ان ہی دنوں ہمارے یہاں بیٹا ہوا تھا، مکھن جیسا، گول مٹول، عین غین اپنی ماں جیسا، مگر میں اس کی ماں کی طرف دیکھتا تھا تو کلیجہ منہ کو آتا تھا، سوچتا تھا کہ اس کا وہ رنگ روپ کہاں گیا، وہ کس خزاں کی زد میں آگیا، کس کی نظر

لگ گئی اسے؟

ایک دن میں جذبات سے مغلوب ہو گیا اور آپے میں نہیں رہا، میں نے اسکو اپنے پاس بٹھایا اور کہا۔ ''بملا تم کیوں مجھ سے چھپاتی ہو کہ تم نے اندر ہی اندر جی کو کیا روگ لگایا ہے؟ یہ کہتے کہتے اس پر سر سے پیر تک نظر ڈالی اور اسکے چہرے کے رنگ کا جائزہ لیتا رہا۔ بملا نے آنکھیں نہیں اٹھائیں۔ میں نے پھر کہا۔ ''تمہارے دل میں اب میرے لئے پیار نہیں رہا'' میں یہ بات زبان پر لانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ خود مجھے اس پر یقین نہیں تھا۔ یہ سن کر اس نے ماتھے پر تیوری چڑھائی اور بولی'' آپ سے یہ کس نے کہہ دیا آپ ہی نے میری محبت مٹی میں ملادی ہے''

یہ جواب سن کر مجھے ہنسی آ گئی حالانکہ اس کا موقع محل نہیں تھا۔ مجھے ہنسنا نہیں چاہئے تھا، میں ہر بات تول تول کر کرنا چاہتا تھا، مگر اس کا جواب سنکر مجھے فخر سا محسوس ہوا، معلوم نہیں یہ کونسی کمزوری ہے کہ اگر میں بیوی کے منہ سے پیار کی ایک بات بھی سنتا ہوں تو پھولے نہیں سماتا۔ میں نے کہا، ''بات کو مت ٹالو، جیسے میں سمجھتا ہی نہیں''

''کیا سمجھتے ہیں آپ؟ اس نے جھلا کر کہا اور نظریں گاڑے مجھے دیکھتی رہی، میں سراسیمہ ہو گیا، لیکن میں نے قصد کیا تھا کہ آج میں سچ اگلوا کے ہی رہونگا۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

''میری طرف سے تمہارا دل سرد ہو گیا ہے''

’’یہ آپ کو لگتا ہے‘‘ اس نے آنکھیں اٹھا کر اس انداز سے دیکھا اور کہا جیسے کہنا چاہتی تھی کہ شاید آپ میری تھاہ لینا چاہتے ہیں، ’’آپ کے بغیر میرا اور کوئی پیارا نہیں‘‘

میں نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ’’یہ بھی نہیں ، بچہ پالنے میں سویا تھا، اسکی ناک بج رہی تھی۔

’’آپ سے زیادہ نہیں‘‘ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات سن کر میرا رواں رواں پسینے میں ڈوب گیا، جسم کے اندر تازگی سی محسوس ہوئی، اور زندگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی ، بند بند کھل گئے ، جیسے انگڑائی لینے لگے ہوں، اس کے اس شوخ انداز اور ان باتوں سے لگا کہ مجھے کبھی بھی اس کی محبت پر شک نہیں تھا۔

میں نے کہا ’’پھر بتاتی کیوں نہیں کہ تم اداس کیوں ہو، تمہیں کونسا غم ہے؟‘‘

’’مجھے کونسا غم ہوگا‘‘ اس نے توقف کے بعد کہا‘‘ مجھے کوئی غم نہیں ہے، لیکن ایک بات اندر ہی اندر کریدر ہی ہے‘‘

’’مجھ سے کیوں نہیں کہتی ہو کہ وہ بات کیا ہے‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’آپ سے کیا کہونگی؟ وہ آپ سے کہنے کے لائق ہی نہیں ہے‘‘ یہ سن کر میرے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا، کچھ ڈرتے ہوئے پریشان ہو کر میں

نے بڑی مشکل سے کہا ''مجھ سے کہو''

یہ سن کر پھر اس کے ہونٹوں پر وہی مسکان کی لکیر ابھر آئی اور کہا،

''کہہ دیا نا اس بات کا آپ سے کوئی سمبندھ نہیں''

''پھر کس سے ہے؟'' میری آواز اتنی ہی دیر ترش ہوگئی تھی، اور میں نے بے قرار ہو کر کہا، ''تمہیں میری قسم، صاف صاف کہو، میں اسکو ڈھونڈ کر لا سکتا ہوں''۔

''مجھے کیا معلوم وہ کون تھا'' اس نے غصے سے کہا (جیسے کہنا چاہتی تھی اب بخش دیجیئے، آپ میرے گلے ہی پڑ گئے)

''تعجب کی بات ہے'' میں نے جواب دیا

''اور نہیں تو کیا، اسی لئے میں بھی سوچ میں پڑ جاتی ہوں''

یہ کہکر وہ پھر کچھ سوچنے لگی۔ اب مجھ میں تاب نہیں رہی، مگر پھر بھی پیار جتا کر کہا،

''تم ہی سوچو، اگر نصیب دشمناں تمہیں کوئی دکھ درد ہو تو کیا میں وہ برداشت کر سکونگا؟'' مجھے اپنی آواز پر شک گزرا، یہ میری آواز نہیں تھی، یہ کوئی اور ہی بول رہا تھا، میری زبان اٹک گئی اور رک رک کر ایک ایک لفظ نکل رہا تھا، اندر دل میں ہزاروں وسوسے اور خیال ابھر رہے تھے، آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی لگتا تھا کہ بملا مجھ سے بہت دور ہے، جیسے میرے پاس تھی ہی نہیں، جیسے شادی کے یہ پانچ چھ سال سوپن مایا تھے۔

آپ کیا کر سکتے ہیں؟'' اس نے میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا،

''آپ کے بس میں ہوتا تو کہتی''

یہ سن کر مجھے محسوس ہوا کہ میرا جسم کانٹوں میں الجھ گیا، پہلے جب وہ اپنی انگلی میرے بالوں میں پھیر لیتی تو میں انجانے سرور میں ڈوب جاتا مگر اس وقت جیسے آگ کا شعلہ میرے بالوں میں سے گزر رہا تھا۔ میں خود ہی بالوں کو کھجانے لگا اور میں نے کہا۔

''پھر بھی کہنے میں کوئی حرج ہے؟ یا یہ کہو کہ میں تمہارا نہیں اور تم میری نہیں ہو' اب میرا لہجہ کچھ زیادہ ہی بدل گیا تھا، یہ میرے دل کی آواز نہیں تھی، شاید وہ یہ سمجھ گئی تو اس نے کہا'' آپ تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں مجھے سنانے میں کوئی حرج نہیں''

ہونٹوں پر بناوٹی مسکراہٹ لاکر، میں نے کھردرے پن سے کہا'' پھر سناؤ نا کہ بات کیا ہے''

اگر چہ ایک طرف میں سنجیدہ ہو گیا، دوسری طرف سے مجھے اپنا جسم ایک بیمار کی طرح تھکا ہوا محسوس ہوا، اتنی ہی دیر میں میرے دل کو دھکا لگا تھا، جیسے میں کسی فیصلے کا منتظر تھا، اندر ہی اندر کوئی کرید رہا تھا اور ہتھوڑے مار رہا تھا۔ ایک سوال میرے ذہن میں تھا جس کا اسے جواب دینا ضروری تھا، مگر جواب میرے پاس نہیں تھا، وہ کسی غیر کے پاس تھا۔ میں مضطرب سا ہو کر

اس کی بات سننے لگا، اس نے بڑے ااطمینان کے ساتھ کہا۔

''سنئے، یہ ان دنوں کی بات ہے جب ابھی میری شادی نہیں ہوئی تھی لیکن آپ کے ساتھ منگنی ہوچکی تھی اور شادی کی تیاریاں ہورہی تھیں، لگن میں ابھی کچھ دن باقی تھے، اس سلسلے میں نانیھال والے مجھے دعوت پر لے گئے تھے۔ میں نے رات کو ماماجی سے ساٹن کی ساڑھی لانے کو کہا۔ لیکن انہیں لانے کی فرصت نہیں ملتی تھی، دوسرے دن مجھے گھر واپس جانا تھا، دفتر نکلنے سے پہلے ماماجی نے مجھ سے کہا۔

''یہ پیسے لے لو اور اپنی پسند کی ساڑھی خود لینا''

دن کو کئی بار میں نے بازار جانے کا ارادہ کیا لیکن نانی اور مامی نے گھر سے باہر جانے نہیں دیا، آخر میں شلوار قمیض پہن کر، سج دھج کے ان سے کہے بغیر ہی بازار چلی گئی۔ پہلے مجھے اکیلی کہیں آنے میں شرم محسوس ہوتی تھی لیکن اب میرا ڈر دور ہوگیا تھا، اس لئے کہ اب میری شادی کی رسمیں شروع ہوچکی تھیں، مجھے اپنا آپ شادی شدہ عورتوں کی طرح بے خوف اور آزاد لگ رہا تھا۔ جس وقت میں ساڑھی خریدنے نکلی اس وقت ہلکی دھوپ تھی۔ شاید کسی طرف سے بادل بھی آرہے تھے، لیکن مجھے معلوم نہیں تھا، جوں ہی میں ساڑھی خرید کر واپس نانیھال کی طرف آ رہی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے موسلادھار بارش آگئی، یہ میں نہ سمجھ سکی کہ اتنی ہی دیر میں اتنے گھنے بادل کہاں سے آگئے، چلتے چلتے میرا جسم بارش سے بھیگ گیا، شلوار ٹانگوں

کے ساتھ چپک گئی۔ لفافے میں نئی ساڑھی تھی، اس میں بھی پانی بھرنے لگا۔ مجھے اپنے کپڑوں کا غم نہیں تھا۔ بھیگ گئے تو بھیگ گئے۔ مگر یہ قیمتی ساڑھی اگر پہنے بغیر ہی گیلی ہوگئی تو کس کو لگے گا کہ یہ ابھی بازار سے خریدی گئی ہے؟ اس لئے افسوس ہورہا تھا۔ دوڑ لگاتی لیکن وہ بھی نہیں کرسکتی تھی، بارش میں بازار سے چلتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میرے بدن پر ایک بھی کپڑا نہیں ہے۔ جیسے سارا بازار میرا تماشا دیکھنے کے لئے دکانوں کے چھجوں پر جمع ہوا ہے۔ کچھ لوگ تنگ گلیوں میں اپنے آپ کو چھپا رہے تھے، کچھ ایک ہی چھاتے کے نیچے چھپنا چاہتے تھے۔ سڑک پر چلنے میں مجھے شرم محسوس ہوئی۔ میں نے راستہ بدل لیا۔ میں بنڈ پر ہوآئی، بنڈ پر پہنچ کر مجھے کسی نے قید سے آزاد کیا ہو، وہاں تیز قدم اٹھانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، میں تقریباً دوڑ پڑی، مگر دوڑنے سے بارش نے کچھ زیادہ ہی مجھے گھیر لیا۔ اتنے میں مجھے سامنے سے آتا ہوا ایک شخص چھاتا لئے نظر آیا، وہ بھی میری ہی عمر کا تھا۔ جوں ہی وہ میرے نزدیک پہنچا، اس نے چھاتے کے نیچے سے مجھے دزدیدہ نظر سے دیکھا۔ میں نے کبھی بھی راہ چلتے کسی سے بات نہیں کی ہے، لیکن اس وقت مجھے اپنی زبان پر قابو نہیں رہا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے کہا،

"سنیئے، آپ یہ چھاتا مجھے دیں گے، مجھے بس وہاں تک جانا ہے"

وہ واپس مڑا، چھتری مجھے پکڑادی اور کہا "لیجیے، آپ ہی رکھ لیجیے"،

''میں نے چھاتا لیا، لیکن اپنی خود غرضی پر بہت شرم آئی، راستے میں میں نے اس کے ساتھ کوئی اور بات نہیں کی۔ اس نے بھی مجھ سے یہ نہ پوچھا کہ '' تمہیں کہاں جانا ہے یا کتنی دور جانا ہے''۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آیا، اس کے قدموں کی آہٹ سے میں سمجھ گئی کہ وہ کوئی آٹھ دس قدم میرے پیچھے آرہا تھا، چھاتے سے میری ساڑھی محفوظ رہی ورنہ گیلا چیتھڑا بن گئی ہوتی۔ جب تک میں نانیھال کے دروازے کے اندر پہنچ گئی، میں بھول ہی گئی تھی کہ میرے پیچھے بھی کوئی آرہا ہے میں اندر سے اپنے آپ کو کوس رہی تھی کہ ابھی نانی اور مامی ناک میں دم کریں گی جب وہ میری ہئیت کذائی دیکھیں گی۔ پتہ نہیں کیا الٹا سیدھا سنائیں گی، یہی سوچتے میں اوپر لی منزل تک پہنچ گئی۔ اتنی دیر میں ماما جی بھی دفتر سے آگئے تھے۔ انہوں نے جب مجھے سر سے پاؤں تک بھیگا ہوا دیکھا تو کہا جاؤ جلدی سے پہلے کپڑے بدل لو۔ میں نے چھاتا وہیں ایک کونے میں چھوڑ دیا اور خود کمرے میں کپڑے بدلنے گئی۔

''کچھ دن بعد ہماری شادی ہوگئی۔ یہ میرے لئے ایک نئی دنیا تھی پھر میں آپ کے ساتھ لداخ گئی۔''

یہاں پہنچ کے بملا نے لمحے بھر کے لئے دم لیا۔ یہ سچ تھا، ان دنوں میری تبدیلی لداخ ہوگئی تھی، بملا کو ساتھ لے گیا، وہاں سے آکر بارہمولہ گیا۔ اس کی باتیں سن کر میرا اشتیاق بڑھ گیا تھا، اس کا دم لینا مجھے اچھا نہیں

لگا، میں نے پوچھا ''اچھا پھر کیا ہوا؟''

''پھر ہونا کیا تھا'' اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا'' بار ہمولہ سے آ کر میں ایک دن نانیھال گئی''

''کیا مجھے اس کا علم نہیں ہے''؟ میں بیچ میں بول اٹھا

''آپ پوری بات سنتے ہی نہیں'' میری طرف دیکھے بغیر ہی وہ کہنے لگی'' نانی کب سے مجھے دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ میں ہی ہوں، دو دن اور دو راتیں وہ مجھ سے صرف لداخ کے بارے میں سوالات کرتی رہی، وہاں کے مکینوں کے متعلق، ان کی رسموں اور رواجوں کے متعلق اور ہم دونوں میاں بیوی کے متعلق''۔

میں نے سنتے ہوئے کہا'' میرے بارے میں بھی؟'' اس پر بملا نے منہ دوسری طرف کیا اور کہا، ''خیر تیسرے دن شام کو ہلکی سی بارش ہوئی۔ میں اس وقت نانی کے پاس بیٹھی تھی، وہ اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کر رہی تھی، میری مامی کچن میں تھی، جوں ہی بارش سے ٹین کی چھت بجنے لگی میری مامی آگ سے تپی ہوئی کچن سے باہر آ گئی، پہلے اپنی ساس کی طرف دیکھا، پھر کھڑکی سے باہر دیکھا اور پھر ساس کی طرف دیکھکر اقراری انداز میں سر ہلایا، میں کبھی مامی کی طرف دیکھتی اور کبھی نانی کی طرف۔ نانی نے ابرو تان کر مامی سے کہا۔ ''سچ؟''

''کیا بات ہے؟'' میں نے ان دونوں سے پوچھا، ''تم اشاروں

اشاروں میں کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ نہیں بیٹی'' نانی نے جواب دیا، لیکن میری تسلی نہیں ہوئی، اٹھکر میں نے کھڑکی سے دیکھا، ان دونوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اس سے میرا شک اور زیادہ بڑھ گیا، کوئی بات ضرور ہے، میں بجھ سی گئی۔

''ذرا، مجھ سے کہو تم دونوں کس بات پر یہ کانا پھوسی کر رہی ہو؟''

نانی نے مجھے حواس باختہ سا دیکھا تو کہا'' کچھ نہیں۔ بیٹی، کوئی خاص بات نہیں ہے، یہ وہاں سڑک کے ساتھ بجلی کا کھمبا ہے نا؟''

مجھے لگا وہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہے، میں نے کہا'' ہاں ہے تو''

''اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا کھڑا ہے''

''ہوگا کوئی'' میں نے جل کر کہا، میرا یہ کہنا نانی کو ناگوار گزرا،

اس نے کہا'' ہماری بھی سنوگی یا خود ہی بولتی جاؤ گی، یہ لڑکا جو وہاں ہے، اسکو وہاں آتے ہوئے کئی سال ہوگئے، جیسے اسکو کسی کا انتظار ہے، نہ کسی کے ساتھ بات کرتا ہے اور نہ ہی کسی کی بات کا جواب دیتا ہے، تمہارے ماماجی کے واری جاوں، انہوں نے بھی کئی بار اسکو وہاں بت کی طرح کھڑا دیکھا، کہا، ''پولیس میں رپورٹ کر دونگا''، لیکن میں نے کہا، ''کیا فائدہ، ہمارا کیا بگاڑے گا؟ خود اسکی ٹانگیں انتظار کرتے کرتے تھک جاتی ہیں''، میں نے نانی کی بات کا یوں ہی اقرار کیا'' آخر یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ کون ہے؟''

''بھگوان جانتا ہے، یہ کچھ کہتا ہی نہیں'' نانی نے حیرت سے کہا،'' وہ دیکھ آج ابھی بارش ہوئی نہیں کہ یہ نمودار ہوگیا۔جب تک ہم آنگن کا دروازہ بند نہیں کرتے اور بجلی بجھاتے نہیں ۔ یہ مائی کا لال وہاں سے ایک قدم بھی نہیں ہلے گا۔اسکو یقین ہونا چاہیئے کہ ہم سو گئے، پھر جائے گا۔جب تک اسکے پاؤں شل ہو جائیں گے۔

نانی کی یہ بات سن کر میرا ذہن پریشان ہوگیا، اٹھکر میں نے کھڑکی سے دیکھا، وہاں واقعی ایک نوجوان بجلی کے کھمبے کے ساتھ کھڑا تھا۔

معلوم نہیں کون ہے، میرے دماغ میں عجیب وغریب خیالات آگئے، میں نیچے کمرے میں گئی۔وہاں میں نے جان بوجھ کر کھڑکی کھولی اور پھر زور سے بند کردی، کھڑکی کے پٹ زور سے ٹکرائے، اس نے اوپر دیکھا، اس کی طرف دیکھکر میرے ہوش اڑ گئے، ایک لمحے میں اسکو پہچان گئی، بجلی کی روشنی میں اس کے چہرے پر بارش کے قطرے سیماب کی طرح چمکتے تھے۔

میں ڈھ گئی، ہوش وحواس ہی نہ رہے، پاؤں من من بھاری ہوگئے، روم روم میں سنسناہٹ دوڑ گئی، مجھے لگا کہ آگ لگ گئی ہے اور ہجوم در ہجوم لوگ اسکو بجھانے کے لئے دوڑ رہے ہیں، یا میرے کانوں میں آبشار گرج رہا ہے، میں ڈری کہ کہیں یہ آبشار مجھے بھی پانی کے ریلے کے ساتھ بہا کے نہ لے جائے، کہیں یہ آگ مجھے بھی دیکھتے دیکھتے بھسم نہ کر جائے، میرے حواس قابو میں نہ رہے، دھڑکتے دل کے ساتھ اسی وقت اوپر کی منزل پر گئی،

آج پانچ سال کے بعد میں چھاتا ڈھونڈنے لگی، نانی نے مجھے کونا کونا چھانتے دیکھا تو پوچھا، ''کیا ڈھونڈ رہی ہو''

''چھاتا''، میں نے کہا، ''ایک دن میں وہ یہاں بھول گئی تھی''

''کیا وہ تمہارا ہی چھاتا تھا''، نانی حیران ہوگئی۔ ''میں نے اوپر چھت کے نیچے سنبھال کے رکھا ہے گھر میں جب اسکا کوئی مالک ہی نہ ملا۔ جاؤ وہیں دیکھو، وہیں ہوگا''۔

میں دوڑ کے اوپر گئی، ادھر ادھر تلاش کیا تو دیکھا چھاتا چھت کے ساتھ لٹک رہا تھا، جیسے مجھے خزانہ مل گیا، ایک دو بار جھاڑا، ساڑھی کے پلو سے صاف کیا اور ڈرتے ڈرتے یہ چھاتا لے کر آنگن کے دروازے پر آ گئی۔ میں باہر نہیں آئی بلکہ دروازے کی اوٹ میں رہی اور اسکو چھاتا پکڑاتے ہوئے میں نے کہا'' یہ لیجئے، چھاتا'' وہ دروازے کے پاس آیا، اسکی لمبی لمبی سانسیں دروازے کی اوٹ سے بھی تلوار کی طرح میری روح کو کتر رہی تھیں۔ سوچا اس دن مجھے کیا ہوا، میں نے اس سے چھتری نہ مانگی ہوتی تو اس بے چارے کو اتنی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی، مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوگئی۔

اس نے چھاتا ہاتھ میں لے لیا اور کہا'' آپ نے کیوں تکلیف کی رکھ لینا تھا۔''

''مجھے معاف کرنا، میں بہت شرمندہ ہوں''، میں نے چہرہ دکھائے

بغیر ہی کہہ دیا۔ سامنا کرنے کی جرات کس کو تھی۔

''یہ کونسا اتنا بڑا معاملہ تھا'' اس نے یہ کس انداز سے کہا۔ میں نے نہیں دیکھا۔

''اور نہیں تو کیا''، میں نے آہستہ سے کہا، میری پلکوں پر آنسو تھے۔

اس نے جواباً کہا، ''یہ تو ایک معمولی سی چیز ہے، میں چھاتے کے لئے فکر مند کہاں تھا''

پھر کس لئے فکر مند تھا۔ یہ میرے دل نے پوچھا۔

ایک لمحے کے لئے دم لے کر اور سانسوں کو ہموار کرنے کے بعد اس نے کہا،

''اس دن بارش تھی نا، میں نے کہا کہ کہیں۔۔۔''

اس کی بات ادھوری رہی کیونکہ مجھے اسی وقت اس سے پوچھنا چاہئے تھا، ''کیا، کہا آپ نے؟'' لیکن میں نے اس بات پر غور نہیں کیا۔ مجھے یہ بات عجیب لگی کہ وہ چھاتے کے لئے بے تاب نہیں تھا، پھر کس لئے تھا؟ پھر کس کا وہ اتنی دیر تک انتظار کرتا رہا، آتا اور جاتا رہا؟

یہی خیال مجھے اندر سے کریدنے لگا۔ اپنے ساتھ سوچتی رہی نہ اب میں اسے کیسے پوچھوں کہ پھر تم کس آس پر انتظار کر رہے تھے برسوں تک، کچھ دیر تک میں زبان نہ ہلا سکی۔ بالآخر میں نے دروازے سے باہر دیکھا کوئی نہیں تھا۔

کچھ لکیریں کچھ نقطے

ڈاکٹر شنکر رینہ

❁ ڈاکٹر شنکر رینہ (کھریار سرینگر ۱۹۳۹۔۱۹۷۷) نے طالب علمی کے دوران ہی افسانے لکھنے شروع کئے تھے۔ حالانکہ ان کی عمر نے وفا نہیں کی، وہ لندن میں ایک کار حادثے میں انتقال کر گئے جہاں وہ مزید طبی تربیت حاصل کرنے کے لئے گئے تھے، پھر بھی انہوں نے چند بہترین افسانے لکھکر کشمیری ادب میں اپنا مقام حاصل کیا تھا۔ انہوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''زتنہ زول'' (چراغانِ شرر) منظر عام پر آچکا ہے وہ ایک بے حد حساس اور درد مند افسانہ نگار تھے۔ وہ ہسپتالوں میں داخل جان لیوا بیماریوں میں مبتلا انسانوں، جن کے ساتھ وہ رات دن ہوتے تھے، کے دکھ درد، خوف اور عذاب کی موثر انداز میں تصویر کشی کرتے ہیں۔ موت ان کا اہم موضوع ہے وہ

خارجی منظرنامے کو ہسپتال کے اندر کے مناظر جہاں موت کے
سائے منڈلاتے ہیں کے تابع رکھتے ہوئے ایک دردناک اور
خوف ناک فضا تیار کرتے ہیں اور قاری کو بھی اس میں شریک
کرتے ہیں۔ڈاکٹر شنکر رینہ افسانے کو غیر ضروری طول دیتے
ہیں، لیکن اس سے افسانے کی گرفت کمزور نہیں
پڑتی۔''ہو چھمِر تھرُ (سوکھی پھولدار جھاڑی)، ''وومی کہنز چھے
وارئ'' (اب کس کی باری ہے)، ''کینہ لکیر تہ کینہ پھیر'' (کچھ
لکیریں کچھ نقطے) ''خون''، ان کے مشہور افسانے ہیں۔

☆☆☆

ایک عرصے سے مجھے لگتا ہے کہ مجھے صاف نظر نہیں آتا۔میں شوخ
رنگ پہچانتا ہی نہیں۔لگتا ہے جیسے ہر چیز کا رنگ اڑ گیا ہے۔
یہ ایک احساس، جس نے سالہا سال سے میرے اندر ہی اندر تلاطم اٹھایا
ہے میں یہ آج بھی بھول نہیں سکتا ہوں میں نے ابھی پھر جھوٹ بولا، میری
رائے میں عظیم کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔لیکن اس سے کیا ہوگا۔مجھے
جھوٹ بولنا ہے ورنہ کلثوم بھی مرجائے گی۔کلثوم کو پورا یقین ہے کہ نیند کے

لئے میں عظیم کو جو مارفین دیتا ہوں اس سے وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔

آج نہیں تو کل ۔۔۔۔۔۔۔ بیوقوف!

جھوٹ کا یہ کاروبار!

مگر میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ سچ کیا ہے۔ خود مجھے کتنی ہی بار دکھ ہوتا ہے جن سے میں نے کہا کہ وہ بچ جائیں گے، وہ بچ نہ پائے، جن کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ مرجائیں گے وہ بچ گئے۔ جو اپنی سمجھ سے باہر ہو، وہ معجزہ ہے۔

ابھی میں پھر جھوٹ بولونگا تا کہ عظیم بچ جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر رحیم ڈار مرگیا تو کچھ نہیں ہو گا مگر اگر عظیم مرگیا اسکے سارے بچے بے سہارا ہو جایں گے۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے بارے میں سوچتا ہوں کہ مجھے زیادہ تر خاموش ہی رہنا چاہیئے۔ اندر اندر ہی سہ لوں مگر اندر ہی کتنا جذب کرسکتا ہوں؟ میں تو گھٹ کے رہ جاونگا۔

آج میں پھر اپنے دل کی دھڑکن صاف سن رہا ہوں۔ لُپ ڈُپ ،لُپ ڈُپ۔ لُپ ڈُپ۔ معلوم نہیں میں آج اتنا بے قرار کیوں ہوں۔ مگر شاید میں ہر روز ہی بے قرار ہوتا ہوں۔

بس وارڈ کی اس کھڑکی سے دور تک صاف دیکھ سکتا ہوں۔ دور سے مکانوں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔ منزل پر منزل بھیڑ اور شور، زندگی کا شور

وغوغا، مجھے یہ شور اچھا لگتا ہے، کیونکہ میں بھی وہیں پیدا ہوا ہوں مگر آج مجھے کہیں دور یہ احساس ہوتا ہے کہ اس شور سے میں الگ ہوں، بالکل اکیلا، ساتھ رہنے سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی کسی کے من کی بات جانتا ہی نہیں۔

اِدھر آج میرے دونوں وارڈوں میں مریض سخت بیمار ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایک پل میں کتنے ختم ہو جاییں گے۔ ابھی ٹھنڈے آنسو ہوا کے ساتھ مل جاییں گے اور آنسو بھری اِس ہوا کا مزہ نمکین ہوگا۔ میرے ہونٹ سوکھ گئے ہیں۔ آج میں یہاں سے جاونگا نہیں۔ مجھے احساس ہے کہ میں موت کے ساتھ اکیلا لڑ رہا ہوں مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس مقابلے میں اسے کیا جیتنا ہے۔ اگر میں یہ درد اور آنسو ختم کر سکتا تو میں موت کی عظمت چھین لیتا، تاکہ موت بدروح لگے جو شاپ ہو۔

دور مکانوں کے پیچھے پہاڑوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہے۔ چوٹیاں جیسے آسمان کے بوسے لے رہی ہیں۔ ایک۔۔۔دو۔۔۔تین ۔۔۔چار۔۔۔پانچ۔۔۔واہ اس کے بعد میری گنتی کھو جاتی ہے کبھی بھی مجھے انہیں گننا نہیں آیا۔ آج یہاں زندگی اور موت کے ساتھ ہوتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ میرے راستوں پر دور دور تک قدم قدم پر صرف پہاڑی سلسلے ہیں، ہزاروں! اتنے کہ ان کو میں گن نہیں سکتا۔

شاید مجھے آج بخار ہے، کیونکہ میرے گلے کے اندر بخارات سے اٹھتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اندر دائیں طرف میری چھاتی میں کچھ جل رہا

ہے۔ باہر بھی دھوپ کی حدت تیز ہے۔ دھوپ مٹی کو بھی بھون رہی ہے۔ کھڑکی سے باہر پھولوں کے پودے بھی سوکھ گئے ہیں۔ پتے بھی مرجھا گئے ہیں۔ مگر مجھے پتہ ہے کہ آج بارش ہوگی۔ میں خوشبو سے ہی پہچان سکتا ہوں کہ کب کیسا موسم ہوگا۔ پھر عادت کسے کہتے ہیں۔

ہاں مجھے خبر ہے کہ آج بارش ہوگی ورنہ اگر ان پھولوں کو وارڈ کی آنسو بھری ہوا لگی تو اِس نمکین پانی سے ان کا رنگ اڑ جائے گا اور یہ سڑ جائیں گے۔

میری نظر بار بار اس باغ کی طرف جاتی ہے۔ یہ باغ مجھے عجیب لگتا ہے۔ اس دکھ، درد آنسوؤں اور چیخوں کے قریب یہ خوبصورت کھلے ہوئے پھولوں سے بھرا باغ۔۔۔ محسوس ہوتا ہے کہ مجھے ہنسی آئے گی۔

آج میرے اندر کے وارڈ میں مریض بہت سیریس ہیں۔ معلوم نہیں مجھے یقین کیوں ہے کہ آج کچھ نہ کچھ ہوگا۔ معلوم نہیں کتنوں پر مٹی پڑے گی۔ وارڑ میں راجہ پھر ان جعفری پھولوں کی طرف نفرت سے دیکھتی ہے۔ ہیں بھی یہ جعفری پھول بھاری، ذرا سی ہوا ہو تو یہ جھومنے لگتے ہیں۔ راجہ کہتی ہے یہ منحوس ہیں۔

راجہ خود بہت بیمار ہے۔ مجھے نہیں لگتا ہے کہ وہ بچ جائے گی۔ مگر میں اب ایک اور جھوٹ بولونگا۔ سچ بھی اگر کہونگا تو کیا وہ یقین کرلے گی۔ یہ عمر بھی کیا مرنے کی ہے؟ ویسے خود اسکو بھی معلوم ہے۔ پچھلی بار میں نے اس پر

واضح کیا ہے کہ وہ دل کی مریضہ ہے اور اگر اسکو پھر بچہ ہوا تو وہ بچ نہیں پائے گی وہ اس سختی کو برداشت نہیں کر پائے گی۔ مگر وہ کہاں مانے گی۔ ابھی بھی نہیں مانتی ہے۔ بچہ مر جائے تو شاید وہ بچ جائے گی، مگر وہ اڑ گئی ہے۔

میری سمجھ کام نہیں کرتی۔ میں پھر باہر دیکھنے لگتا ہوں مگر راجہ پھر بار بار میری آنکھوں کے سامنے آتی ہے، سانس واپس آنے پر وہ کس شوق اور پیار کے ساتھ اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرنے لگتی ہے جیسے کبھی درد تھا ہی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ انسان کے اندر محبت کا ایسا سمندر ہے جس سے کوئی قابو میں نہیں لا سکتا۔

آسمان پر بادل چھا گئے۔ ہر طرف سردی ہے، درختوں میں جان سی آ گئی ہے پھولوں نے سر اٹھایا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں دور قبرستان کے ایک کونے میں ایک سنگ ساز پتھروں سے سنگ مزار بناتا ہے ایک ۔۔۔ دو ۔۔۔ تین ۔۔۔ چار ۔۔۔ پانچ۔ اس کے بعد میری نظر کھو جاتی ہے۔ اور میں سوچ نہیں سکتا کہ یہ سنگ مزار کس پر رکھے جائیں گے اور میری آنکھوں کے سامنے راجہ، نورہ، رحیم ڈار اور عظیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ میری ریڑھ کی ہڈی تک تھراتی ہے۔

سوچتا ہوں کہ میں ان باتوں پر توجہ نہ کروں۔ اب تک میں سوچتا ہی رہا لیکن کہیں نہیں پہنچتا۔ دل پر بوجھ ہے۔ بارش ہونے لگی اور سارے گرد و غبار کو چوس کے لے گئی ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر کی

آگ پھر بھی نہ بُجھے گی۔مگر میں خوش ہوں، بارش کی آواز میں وارڈ کی

ہائے، ہائے گم ہوگئی ہے۔ یہ بارش تھمنی نہیں چاہیئے۔

دور سے میں پھر سنگ مزار دیکھتا ہوں، معلوم نہیں کیوں مجھے لگتا ہے

کہ وقت کم ہے۔ مجھے اپنے کندھوں پر بوجھ محسوس ہوتا ہے اور یہ سنگ مزار

طویل عرصے سے مجھ پر بیٹھا ہے۔پھر میں سانس کیسے لے سکتا ہوں؟ میں

خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔مگر میں خواب دیکھنا ہی بھول گیا ہوں۔اس

آنسو بھری ہوا نے میرے خوابوں کی رنگینی کب کی چوس لی ہے۔میرے

خوابوں کا رنگ اڑگیا ہے۔مگران احساسات کا کیا کروں جو کیچڑ کی چھینٹوں

میں بھی دھنک رنگ بھرتے ہیں۔

بارش مسلسل ہورہی ہے

سنگ مزار بارش سے ڈُھل گئے ہیں

کیا ان پتھروں کے اندر بھی پانی جائے گا، ہوسکتا ہے کہ میں بھی

تری محسوس کروں۔وارڈ میں ہائے، ہائے میں اضافہ ہورہا ہے اور میں یوں

ہی وارڈ میں داخل ہو جاتا ہوں۔ابھی بھی سنگ مزار میری آنکھوں کے

سامنے ہیں مجھے نہیں معلوم کہ یہ کن پر رکھے جایں گے۔کچھ عجیب سا لگتا ہے

کہ اتنا شور ہونے کے باوجود عجیب چُپ ہے۔سب بیڈوں پر بیمار ہیں لیکن

مجھے خالی پن کا احساس ہوتا ہے جیسے یہاں کوئی نہیں۔

رام جو مجھے دیکھ کر حسب معمول رحیم ڈار کے ساتھ باتیں کرنے لگتا

ہے۔ ''یہ بھی اولاد ہوئے چلنے پھرنے سے معذور کیا ہوا، دیکھنے بھی نہیں آئے''۔رحیم ڈار نے جواب دیا۔ ''مجھ سے آپ کیا کہیں گے میں خود مایوس ہوں''

رام جو کی آنکھوں میں آنسو آئے۔اس بوڑھاپے میں وہ مجھے چیل کے مانند دکھائی دیتا ہے۔مجھ میں اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوتی ، مجھے ہی کیا کسی کو بھی نہیں ۔ اور اسکو شکایت ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو ہمدردی نہیں ہے۔اس کے پاس جا کر ہمیشہ میں سوچتا ہوں کہ کاش میں کوئی ایسی بات اس سے کہہ سکتا جس سے اسکو تسلی ہو جاتی۔مگر مجھے ایسا کچھ بھی کہنا نہیں آتا اور وہ اُدھر ہی سے مجھے دولتی مارتا ہے۔''اب اس سے بہتر مرنا ہی ہے'' اور میں سمجھ جاتا ہوں کہ وہ شدید تکلیف میں ہے۔بات کوٹالنے کی غرض سے میں اس کا چارٹ دیکھنے لگتا ہوں اور وہ کہتا ہے'' ذرا مجھے انڈا اور کلیجی کھانے کو لکھئے ،مجھ میں طاقت ہی نہیں'' یہ کہتے ہوئے اسکی سانسیں رک جاتی ہیں اور رگیں ابھر آجاتی ہیں میں محسوس کرتا ہوں کہ اب یہ نہیں بچے گا۔وہ تڑپتا ہے اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہے، جو کہتی ہیں ''میں پھر سے پہلے کی طرح صرف ایک سانس لے سکوں'' میں اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھکر آگے بڑھ جاتا ہوں۔مجھے لگتا ہے اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔آگے چل کر پیچھے سے میں سنتا ہوں کہ رام جو رحیم ڈار کے ساتھ مظفر کے بارے میں غیبت کرنے لگا ہے۔ان کو اس بات

پر یقین نہیں ہے کہ جو عورت ہسپتال مظفر کو دیکھنے آتی ہے وہ اسکی بیوی ہے۔ یہ باتیں کرتے ہوئے ہمیشہ وہ اپنا درد بھول جاتے ہیں۔

مظفر کے بیڈ کے پاس ایک لڑکی میڈیکل سٹوڈنٹ، اسکا معائنہ کرتی ہے۔لڑکی بہت خوبصورت ہے اور مظفر اسکو باتوں میں لگائے رکھتا ہے۔اور کبھی اسکو ہنساتا بھی ہے۔رام اور رحیم ڈار کو یہ عجیب لگتا ہے۔انہوں نے مجھ سے سو بار پوچھا ہے کہ یہ لڑکی کیوں صرف مظفر کا ہی چیک اپ کرتی ہے۔ میں کچھ نہیں کہتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ مظفر ان کو جان بوجھ کر بیوقوف بناتا ہے۔ معلوم نہیں میں اس پر خوش کیوں ہو جاتا ہوں۔رام جو اور رحیم ڈار کا درد پھر تیز ہو جاتا ہے اور سنگ مزار پھر مجھے نظر آتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مظفر کی آدھی جان اس سنگ مزار کے نیچے دب گئی ہے

اسی اثنا میں وارڈ میں ٹرولی داخل ہوتی ہے۔ اس کے پہیوں کی چرچراہٹ سن کر مجھے لگا کہ جیسے کوئی بچہ پاوں کے نیچے آ گیا ہو۔ مریض کا چہرہ دیکھ کر ہی جیسے مجھے بو آتی ہے کہ یہ بچ نہ پائے گا۔ آخر تجربہ بھی تو کچھ ہے۔ پھر مجھے لگا کہ میں اپنے متعلق زیادہ سوچتا ہوں۔

لال کمبل کے اندر ٹرولی پر مریض کوئی حرکت نہیں کر رہا ہے۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔ جیسے اس لال کمبل نے اس کا سارا خون چوس لیا ہے۔ سارے ماحول میں جیسے کانٹوں کا جال پھیل گیا۔ سب کی نظریں میری طرف لگی ہیں۔ نبض دیکھتے ہوئے پھر مجھے اپنی مجبوری کا

احساس ہو جاتا ہے۔ مریض جوان ہے مست جوانی میں جیسے گہری نیند میں ہے۔ میں اکسیجن لگاتا ہوں تو وہ حرکت میں آتا ہے۔ لگا جیسے کسی کو پکار رہا ہے۔ سوچتا ہوں، کاش میں ان باتوں کو کوئی معنی نہ دیتا اور باہر دیکھنے لگتا ہوں۔ باہر سے ایک عورت روتے پیٹتے اندر آتی ہے، شاید کوئی بیمار عورت ہے۔ میری آنکھوں میں دھند چھا جاتی ہے۔ محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے میرے چہرے پر شاخ گُل سے وار کیا۔ وہ بے حد حسین عورت ہے۔ لگا کہ وارڈ کی ساری کھڑکیاں کُھل گیں۔ بستر پر بیماروں کو جیسے چونٹیاں لگ گیں۔ وہ آگے آ کر اس مریض سے لپٹ گئی، اسکو احساس ہی نہیں کہ وہ مجھ سے بھی چپک سی گئی ہے۔ وہ میرے اتنے قریب آ گئی کہ اس کے بدن کی گرمی میں نے محسوس کی۔ میرے ہاتھوں کی حرکت تیز ہو گئی، انجکشن لگاتے ہوئے مجھے وین ہی نہیں ملتی۔ چار بار سوئی چبھو کے بھی نہیں حالانکہ مجھے اندھیرے میں بھی وین پکڑنے کی عادت ہے، میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ آکسیجن کھولتے ہوئے میں نے اس بیمار کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر درد کی سیاہی پوتی گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے سب کچھ دھندلا نظر آئے۔

رحیم ڈار اپنا درد بھول ہی گیا ہے۔ وہ سانس روک کر لگاتار اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے۔ ململ کے جمپر کے اندر سے اسکی باڈی اور چھاتیوں کا ابھار نظر آتا ہے۔ جمپر میں اسکے جسم کا گوراپن دھمک رہا ہے۔ میں

رحیم ڈار کی طرف دیکھتا ہوں، مجھے لگا کہ میں ہنس پڑونگا۔ مظفر کچی نیند میں جاگ گیا اور بیمار کی طرف ایک نظر ڈال کر وہ بھی اب اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھی اداس ہے۔

مریض ابھی بھی ہوش میں نہیں آیا ہے۔ میں آکسیجن کا پریشر بڑھاتا ہوں۔ وارڈ میں کوئی اُوں بھی نہیں کرتا، صرف اس عورت کی ہچکیوں کی آواز ماحول میں تیر رہی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ عورت کا ایک قطرہ آنسو بھی۔۔۔۔۔اسکی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں اور اسکی پلکیں بھی بھری ہوئی دکھائی دے رہی ہیں، لیکن آنکھوں سے ایک قطرہ آنسو بھی ڈھلکتا نہیں ہے، جیسے اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کے بدلے ابالا ہوا تیل ہے اور یہ تیل چپک جاتا ہے۔ مجھے آنسو ہی اچھے لگتے ہیں۔ ان میں روانی ہوتی ہے۔ اور موتی جیسے آنسو آنکھوں میں سے درد کی سیاہی کو چوس لیتے ہیں۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ بہت ہی عذاب میں ہے۔ رام جو اٹھکر عورت کو تسلی دینے کے لئے اس کے قریب جاتا ہے مگر وہ ہکلانے لگتا ہے، اس کا عورت کو تسلی دینے کے لئے اٹھنا مجھے عجیب لگا۔ وہ خواہ مخواہ اسکی بانہہ پکڑتا ہے حالانکہ اس کا کوئی موقع ومحل نہیں تھا۔ مجھے لگا وہ ایک انچ گھٹ گئی، جیسے زمین کے اندر دھنس گئی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جوں ہی رام جو نے اسکو چھوڑ دیا، اسکے بازو پر گہرا نشان پڑ گیا تھا حیرانگی یہ ہے کہ رام جو کے ہاتھوں میں اتنی طاقت کہاں ہے؟ عورت جیسے پھول گئی اور اس کی ہچکیاں

اور تیز ہو جاتی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ میں اپنے کان بند کر دوں مگر مریض کے نبض پر ہاتھ رکھکر ہی میں باہر دیکھنے لگتا ہوں۔ بارش لگاتار ہو رہی ہے۔ پانی چھاجوں برس رہا ہے۔ مجھے باغ میں کچھ نظر نہیں آتا ہے جیسے میری آنکھوں پر پردہ گر گیا ہو۔ ایک پھول بھی نظر نہیں آتا۔ صرف کانٹے ہی کانٹے، معلوم نہیں میں کیوں سوچتا ہوں کہ اس بارش کے ساتھ آسمان بھی زمین پر نہ آ گرے اور ان کانٹوں پر اس کی دھجیاں اڑ جایں۔ میں باہر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ میں آکسیجن بڑھا رہا ہوں۔ مریض کے ہونٹ ہلنے لگے۔

عورت میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھتی ہے۔ وہ بے حد خوبصورت ہے۔ اسکی ہلکی آسمانی ساڑی بارش سے اسکے جسم کے ساتھ چپک گئی ہے۔ اور جسم کے خطوط الگ الگ دیکھے جا سکتے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے پھر باہر کے کانٹے آ جاتے ہیں۔ سوچتا ہوں اس سے بھی کہہ دوں مگر میں کہہ نہیں سکتا۔ میں اسکی طرف دیکھتا رہا، مجھے لگا کہ مظفر بہت دیر سے مجھے دیکھتا رہا ہے اور میں شرم سے لال ہو جاتا ہوں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرے خیالوں میں کہیں شگاف پڑ گیا ہے اور اس میں سے دیکھکر سب جان گئے ہیں کہ میں کیا سوچتا ہوں اور میں پھر سوچنے لگتا ہوں۔ مریض کو ہوش آنے لگا ہے۔ وہ کروٹ بدل کر جیسے نیند سے بیدار ہو گیا اور عورت کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

''تم کیوں روتی ہو؟''

''کچھ نہیں۔اب تم کیسے ہو!''

میں ٹھیک ہوں، میں جانتا نہیں کہ ہو کیا گیا تھا، مجھے ابھی بھی درد ہے۔عورت کی ابھی بھی ہچکیاں لگی ہیں۔

''تم کیوں روتی ہو؟ تمہیں کیا ڈاکٹر نے کچھ کہا۔ان کی عادت ہے یہ یوں ہی بیماروں کو ڈراتے ہیں''

عورت کو ہنسی آتی ہے۔میں نے سوچا مریض سچ ہی کہتا ہے۔

رات آگے بڑھنے لگی۔بارش تھم گئی، آسمان صاف ہو گیا، مگر دیکھتے ہی دیکھتے بادل نے چاند کو نگل لیا۔اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔باہر ہر جانب دھواں ہی دھواں ہے۔آدھ جلی لکڑی کا دھواں، دھویں کی چادر، ہر طرف خاموشی ہے۔میں اس خاموشی سے ڈرتا ہوں۔

''میرے لئے سگرٹ جلاو۔میں ٹھیک ہو جاونگا۔میری ا نبض دیکھو۔مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب اس میں ٹھہراو آ گیا ہے، ہے نا؟

عورت اسکی نبض دیکھتی ہے'' مجھے تمہاری نبض اچھی لگتی ہے، یہ ایک ہی طرح چلتی ہے۔جیسے تمہاری محبت''۔

''نبض میں اتار چڑھاؤ ہو سکتا ہے۔مگر میری محبت میں نہیں'' وہ کھلکھلا کر ہنستی ہے اور مرد اسکو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔رحیم ڈار اور رام جو اوڑھنا سر کے اوپر لیتے ہیں اور مظفر کروٹ بدلتا ہے۔

''تم میں یہی عیب ہے، تم صبر کیوں نہیں کرتے ۔یہ گھر نہیں

ہے۔ ہے نا''

''یہی تم میں اور مجھ میں فرق ہے'' عورت ہونٹ صاف کرتی ہے۔ ''میں اس طرح نہیں سوچ سکتی''

''کبھی نہیں''؟ ''بہت کم''

''تم کتنی بلند پایہ ہو''

''نا، میں تو ایک سیدھی عورت ہوں''

''تو۔۔۔ میرے لئے سگرٹ جلاؤ۔۔۔ میں ذرا پاگل۔۔۔''

سگرٹ پی کر اسکو ہچکی لگ جاتی ہے اور گردن لٹک جاتی ہے۔ ہر طرف موت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور میں دوڑ کے اس کے پاس پہنچتا ہوں۔ اسی وقت بجلی کی کڑک دار چمک کھڑکی کے شیشے سے اندر آ جاتی ہے۔ سب اچھل کر بیدار ہو جاتے ہیں۔ مریض کی نبض ڈوب رہی تھی، بلڈ پریشر بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسکی سانسوں میں اتار چڑھاؤ ہے۔

نرس مجھے اطلاع دینے آئی کہ راجہ کا بچہ ہوا مگر وہ بے ہوش ہے۔ میں جا کر اس کو انجکشن دیتا ہوں مگر وہ لمحہ بہ لمحہ ختم ہو رہی ہے اور نوزائید بچہ زور زور سے رو رہا ہے اور یہ شور میرے کانوں میں ہی رک جاتا ہے۔

میری سمجھ کام نہیں کرتی۔۔۔ مریض کو پھر ہوش آنے لگا ہے۔ عورت مجھ سے پوچھتی ہے کہ اسکو یہ کیا ہو گیا تھا۔ ''مجھے نہیں

معلوم'' کہتے ہوئے ہی میں نے سوچا کہ خوامخواہ میری آواز کھردری اور لہجہ سخت ہو گیا۔

میں اپنے کمرے کی طرف پھر جاتا ہوں۔ بارش شروع ہو گئی ہے' تیز ہوا سے چنار کے پتوں سے عجیب صدا آتی ہے۔ لگتا ہے راجہ کا نوزائید بچہ اپنے وجود کا اثبات کرتا ہے۔ موسلا دھار بارش ٹین کے چھت کے ساتھ ٹکرا جاتی ہے۔ جیسے پہاڑوں کی چوٹیوں سے چٹانیں پھسل کر گر جائیں گی اور گرتی ہی جائیں گی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ میں اندھیرے میں ہی باہر نظر ڈالتا ہوں اور ڈھونڈتا ہوں، چوٹیاں، کوہی سلسلے، مٹی اور اینٹ کے مکانوں کی قطاریں کئی کئی منزلوں کے، اور ایک کونے میں پتھروں سے تراشے ہوئے سنگ مزار۔

چاروں طرف چُپ ہے۔ میں آج واقعی چاہتا ہوں کہ یہ خاموشی ٹوٹ جائے۔ اس دماغ میں یہ ابھرتے خیالات بھی ٹوٹ جاتے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جیسے میں ہوا میں تیرتا ہوں کھڑکی سے باہر چھجے پر ہی، چھجہ مجھے عجیب لگتا ہے۔ اس چھجے کے اس پار زخم اور انکا درد ہے اور اس پار کھلی دنیا، ہنسی، پھول اور درخت ہیں۔

میں پھر خود ہی اپنے ساتھ ہنستا ہوں۔

رات اب ڈھلنے لگی ہے۔ سحر کی ہلکی ہلکی روشنی جیسے سب کو گلے لگا رہی ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی دھوپ پھیلنے لگی ہے۔ اس میں پھر مجھے

سنگ مزار نظر آتے ہیں۔

بارش سے بھری ہوا پاگل ہوگئی ہے۔

نرس پھر دوڑی دوڑی آئی کہ مریض کو پھر کچھ ہو گیا۔ وہ بات ہی نہیں کرتا ہے۔ وہ شاید ختم ہو گیا۔

میں اس سے کچھ نہیں کہتا، صرف مسکرا رہا ہوں۔

دور اب چوٹیاں پوری طرح روشن ہوگئی ہیں۔ آسمان جیسے آئینہ بنا ہے۔ اس میں مجھے اپنی اس پیاری زمین کی شکل نظر آتی ہے، چمکتی سنہری لکیریں اور بندی جیسے نقطے۔

اب کہاں جاوگے

سید رسول پونپر

رسول پونپر (۱۹۳۹ بچھواڑہ، کشمیر) ایک شاعر، محقق اور تنقید نگار کی حیثیت سے اپنی اہمیت منوا چکے ہیں اور انہوں نے کچھ افسانے بھی لکھے ہیں۔ وہ مختلف رسالوں کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں، ان کے کئی شعری، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے مجموعے چھپ چکے ہیں اور ایک افسانوی مجموعہ ''وونی کور گژھکھ'' (اب کہاں جاو گے)۔ انہوں نے ترقی پسندی کے زیر اثر آج کے دور کے انسانی مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظر میں آج کا انسان تخریبی حالات کا شکار ہے، اور وہ جھوٹ، رشوت، لوٹ کھسوٹ، رشتوں کی شکست، خود غرضی اور خوابوں کی شکست کا سامنا کر رہا ہے۔ افسانہ ''وونی کور گژھکھ'' (اب کہاں جاو گے) اس صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔

جب کامریڈ جیلانی بیدار ہو گیا، ہوش میں آیا اور آنکھوں کو ملنے کے لئے ہاتھ اٹھانا چاہا۔ ''یہ کیا؟ ان میں بیڑیاں پڑی ہیں، میں ذرا ٹانگیں اوپر اٹھاؤں، میرا سارا جسم جیسے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ دیکھو، یہ بھی بندھی ہوئی ہیں''

اس نے ہاتھ ذرا اوپر اٹھائے تو دیکھا کہ واقعی اس کو چارپائی کے پائیوں کے ساتھ باندھ کے رکھا گیا ہے۔ وہ حواس باختہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کیوں نہ میں ایسی انگڑائی لوں کہ جسم کا بند بند الگ الگ ہو جائے اور مجھے عذاب سے نجات ملے۔

''کیا میں دیوانہ ہو گیا ہوں، پاگل ہو گیا ہوں جو میرے ہاتھ پاؤں جکڑ دیئے گئے ہیں۔ کہتے ہیں نا کہ پاگلوں کو بیڑیوں سے جکڑ دیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟

کسی نے آکر اسکی بیڑیاں کھول دیں تو وہ سیدھا ہو کر چارپائی کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اسکو لگا کہ یہ ساری دنیا مٹی کی بنی ہے جو لرزاں ہے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر رہی ہے۔ انسان پاگل کتا بن گیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ حیوان ہی ہے۔ گند کھانے پر آئے تو یہ ناموں کا فرق بھی مٹ جاتا ہے۔ اس کو یاد آیا کہ جب اس نے پرسوں ہسپتال کے ملازموں کی شکایت ڈاکٹر سے کی کہ مریضوں کو پوری روٹی بھی نہیں دی جاتی ہے اور سبزی گوشت برتنوں میں بھر بھر کر پچھلے دروازے سے نہ جانے کہاں کہاں پہنچایا جاتا ہے تو ڈاکٹر نے کچن کی نگرانی اسی کو سونپ دی۔ یہ تو اچھا ہی ہوا تھا، لیکن یہ جمعداری بھی الٹی اس کے گلے

پڑ گئی۔ ایک دن تو انہوں نے صبر ہی کیا، بہت صبر، گند کھانے والے بھوکے کا زبردستی صبر کرنا بھی بہت بڑا احسان ہے۔ وہ جتنا بھی ہوگا، اتنا ہی بڑا بارِ احسان ہے۔ آخر انہوں نے کل ڈاکٹر سے جھوٹ کہا، اس کا دماغ آج پھر ذرا گرم ہو گیا ہے اور نیند کا انجکشن لگا کر اسی وقت مجھے سلا کے رکھا، پھر معلوم نہیں کہ بیڑیوں سے کب مجھے جکڑ دیا گیا۔ جو چاہا کرلیا، جو کرتے آئے تھے وہی آج بھی کیا۔ مصیبت زدوں کی روٹی پر بھی ان کی نظر ہے۔ یہ تو اندھیر ہے۔ ہے تو، سنے گا کون؟ اس کا مداوا کرے گا کون؟ اسکو اپنا وجود اب پورے ہوش وحواس میں محسوس ہوا اور پوری طرح اپنا جائزہ لینے لگا اور اس کو لگا کہ وہ ابھی اسی دنیا میں ہے۔ اپنے ہی انسان بھائیوں میں جو ایک دوسرے کے درپے آزار ہیں۔

اسکو آج تین ماہ پہلے کا وہ دن یاد آیا جب وہ اپنے بھتیجے کی شادی پر رشتہ داروں کو مدعو کرنے گھر سے نکلا تھا۔ وہ حسن پورا اپنی بہن کے گھر پہنچ گیا اور وہاں سے وہ شوپیان دوسری بہن کے گھر گیا اور وہاں رات لگ گئی۔ رات کو ہی بستر میں اس نے طے کیا کہ وہ اپنے آپ کو ختم کردے گا، خودکشی کرے گا۔ اس کو ہنسی آئی، بزدل! معلوم نہیں کیوں؟ مگر یہ کس نے کہا کہ اپنی جان کے ساتھ کھیلنا بزدلی ہے، جھوٹ سراسر جھوٹ۔ اس میں ذرا بھی سچائی نہیں ہے، مگر میں یہاں اپنے آپ کو ختم نہیں کرونگا، خوامخواہ کسی پر الزام آئے گا۔ میں کہیں دور جاونگا، اپنوں اور پرایوں سے دور، جہاں کوئی نہ پہنچ پائے، جہاں میری خودکشی کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو جائے، جہاں کسی کو میرے مرنے پر دکھ نہ ہو۔ سب اپنے اپنے لئے ہیں،

بیوی، بچے، رشتہ دار، یار دوست سب جھوٹ، اپنا سایہ بھی جو اندھیرے میں ساتھ چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے۔

میرا جسم کیوں بھاری ہو گیا، دم گھٹ رہا ہے، کیوں نہ میں اپنے کپڑے پھاڑ کے ابھی نکل جاوں! نہیں پہلے رات تو گزر جائے، پھر دیکھ لونگا۔۔۔ یہ کون کھڑی ہے؟ سارا؟ ڈائن! بندریا!! میری بیوی!!! میری نصف زندگی! معلوم نہیں کیسے؟ یہ کون کہتا ہے کہ یہ نصف بہتر زندگی ہے، بلا مارو، اس تاریکی میں بھی میرے پیچھے پڑی ہے میں نے آنکھیں بند کرلیں، پہلے زندگی تو ہو، پھر دیکھتے ہیں آدھی یا پوری۔

یہ کون ہے؟ میری آنکھوں کی روشنی! میرا لال! میری طاقت، لخت جگر! مگر بھک منگا جیسا، اس کو ہم ہی نے جنم دیا ہے، اسکو ہم ہی نے داو پر لگایا ہے، غنچہ جو کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا ہے، آو (میں تیرے صدقے) میرا گلا گھونٹ لو، میں اسی کا سزاوار ہوں، تم ہی عادل ہو، ہاں میرے مرجانے سے تمہیں کیا ملے گا، تم پھر بھی مصیبتوں ہی میں گھرے رہو گے، جیسے میں گھرا ہوا ہوں! نہ صحت نہ کام نہ کاج، بیکار جی رہا ہوں۔

مجھے نیند کیوں نہیں آرہی ہے؟

یہ کون ہے؟ حلیمہ؟ واقعی نرم اور حلیم! جگر کا ٹکڑا، جوان بیٹی، میرے لئے جلتے انگارے، دیکھ مجھے کیسے دیکھتی ہے، جاو بیٹی پتھر کی طرح منجمد ہو جاء، تاکہ کوئی طعنہ نہ دے۔ تم کو پالے گی تو اپنی ماں ہی، بندریا، ڈائن، جیسی بھی ہے تمہاری ماں ہے، میں کیا کرونگا، اب میرا پیچھا چھوڑ دو، جاو، مجھے رخصت کرو، جاو خدا کے۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ موت کے حوالے، وہی

یاوری کرے گی، وہی انجام کار تمام مسائل کو حل کرتی ہے۔ معلوم نہیں کہاں چھپ کے بیٹھی ہے، مصیبت کی ماری!

مجھے نیند کیوں نہیں آتی ہے، صبح تو نہیں ہوئی، نہیں ابھی نہیں، یہ رات لمبی ہوگئی، گلا سوکھ گیا، پانی کون پلائے گا؟ کس سے کہوں؟ ان پر بھی نیند نے کیوں غلبہ کیا، پھنس گیا تو میں ہی پھنس گیا، ان کا کیا قصور۔

وہاں سے میں صبح سویرے ہی نکلا اور جموں کا راستہ لیا۔ معلوم نہیں میں اس وقت حواس میں تھا بھی یا نہیں، کیوں نہ میں یہیں سے نیچے چھلانگ لگا دوں، ہڈیاں بھی نہیں ملیں گی، دیکھ اس سکھ نے مجھے اپنی گاڑی میں اٹھا لایا، یہ سوچا ہی نہیں کہ کہیں وہ میری موت کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔ کیا میں زندگی سے تنگ آیا ہوں؟ مجھے اپنے آپ سے نفرت تو نہیں ہوگئی ہے؟ جس کا انصاف کرنے میں یہاں آیا ہوں۔ یہاں اپنے آپ کو مارنا ٹھیک نہیں ہوگا یہ بے چارہ ایک تو مجھے یہاں تک اٹھا لایا اور میں اسے یہ معاوضہ دوں؟

پٹھان کوٹ سے میں لدھیانہ پہنچ گیا۔ وہاں میں سکھوں کے مویشی بھی پالتا رہا۔ انہوں نے سوچا، اچھا خدمت گار مل گیا جو انکے مال مویشوں کی دیکھ بال کرتا ہے۔

کیوں نہ میں زہر کھا لوں؟ لیکن ملے گا کہاں؟ لا کے کون دے گا؟ کیا ان کو اپنی موت کا ذمہ دار ٹھہرانا ہے۔۔۔ چھوڑ دو مجھے۔۔۔ ان کے لئے بھی جب میں وبال جان بن گیا تو انہوں نے مجھے گاڑی میں ڈال کے یہاں پہنچا دیا۔ کہتے ہیں میں وہاں آوارہ پھر رہا تھا، پاگلوں کی طرح، بے خبر، بے نشاں، ہری کرشن نے مجھے یہاں پہنچا دیا، اس کو منٹل ہسپتال کہتے

ہیں، پاگل خانہ۔۔۔ کہتے ہیں مجھے یہاں رہتے ہوئے ایک ماہ سے بھی زیادہ عرصہ ہوگیا۔ دیکھو کیا یہ دنیا ایک بہت بڑا پاگل خانہ نہیں ہے؟ مجھے یہاں پہنچادیا گیا، واقعی میرا دماغ پھر گیا تھا، میں سچ مچ پاگل تھا۔ کیا گھر میں شادی ہوگئی ہوگی؟ ہاں میرے بغیر کیا دنیا نہ چلے گی، میرے بچے میرا انتظار تو نہیں کررہے ہونگے انکی ماں نے کیا کیا ہوگا؟ دھان کی فصل کاٹی ہو گی؟ جاڑا ابھی نزدیک آرہا ہے۔

دیکھ میں ابھی بھی کیا سوچ رہا ہوں؟ معلوم نہیں انہیں کن کن پریشانیوں اور ضرورتوں کا سامنا ہوگا، خیر وہ ان کے لئے نئی تو نہیں ہیں۔ ہم سب پاگل کتے ہیں، ہم سب پاگل ہیں، ایک دوسرے کو اذیت دینے پر تلے ہیں، کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ زور زور سے رودوں، نہیں یہ کہیں گے اسکو کیا ہوگیا اور پھر بیڑیوں میں جکڑ کے رکھ دیں گے۔

"اٹھو جاو، تم کو ڈسچارج کیا گیا، تم ٹھیک ہو گئے ہو، بالکل ٹھیک"

مجھے جھٹکا سا لگا، جیسے گہری نیند سے بیدار ہوگیا، میں نہ جانے کہاں کہاں کھو گیا تھا۔ سر اوپر اٹھا کر میں نے نظر بھر کر دیکھا۔ یہ میرے بیڈ کا داروغہ تھا، شاید ڈاکٹر۔ شام کے پانچ بج چکے تھے۔ میں نے لمبی آہ بھری۔۔۔ میں نے خود سے کہا، اٹھ نالائق کر تیاری۔۔۔۔۔ میں ایک دم سے بیڈ سے اٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے چلا۔۔۔ اور پرنم آنکھوں سے ہسپتال کے درودیواروں اور اپنے مصیبت زدہ ساتھیوں سے رخصت لی اور کہا، میں جا رہا ہوں۔۔۔ مرنا ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن یہاں نہیں۔۔۔ ایسے نہیں ۔۔۔ اچھا خدا حافظ!۔۔۔ لیکن؟

آدم خور

امر مالموہی

﴿امر مالموہی (۱۹۴۰ ماگام) بھی ابتدا میں اردو میں افسانے لکھتے تھے ۶۵۔۶۶ میں کشمیری زبان میں لکھنا شروع کیا۔ وہ اردو، ہندی، کشمیری میں لکھتے ہیں۔ انہوں نے جب لکھنا شروع کیا ترقی پسندی کا زور ختم ہو چکا تھا اور ادیب و شاعر نئے زمانے کے نئے مسائل اور صورتحال سے دوچار تھے اور نئی آگہی سے روشناس ہو گئے تھے اور امر مالموہی نے بھی اس جدید نظرئے کے تحت جدید انداز میں علامتی اور تجریدی افسانے لکھے ہیں ان کے افسانوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن پھر بھی افسانہ نگاروں میں ان کا نام نامی نمایاں ہے۔ ان کا ایک رومانوی ناول ''تریش تہ ترپن'' (پیاس اور تڑپن) چھپا ہے۔ ''آدم خور'' ان کا ایک علامتی افسانہ ہے۔ امر مالموہی نے کشمیری برہمن سوم دیو کی لوک کتھاؤں، ''کتھا سرت ساگر'' کا سنسکرت سے کشمیری زبان میں ترجمہ کیا ہے﴾

اس نے میری طرف رحم طلب آنکھوں سے دیکھا۔شاید اس کا خیال تھا کہ مجھے اس پر رحم آئے گا۔ بنیادی طور پر وہ سینکڑوں سال قبل کی دنیا میں جی رہا تھا۔ اسلئے اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ جنگل ابھی موجود ہیں اور 'ہی ون' برجستہ ہے۔ شاید وہ اس وقت بھی سرکنڈوں کے جنگل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کے کان اس وقت بھی جنگلی چڑیوں اور پرندوں کے نغمے سن رہا تھا۔ اس کو ابھی بھی ایسا لگتا تھا کہ میں اسے گھونٹ بھر امرت پلا دوں گا۔ وہ امرت جو اس نے سمندر کا منتھن کر کے میرے حوالے کیا تھا مگر میں وہ نہیں سوچتا تھا، جو وہ سوچتا تھا۔ وہ بنیادی طور پر بے وقوف اور احمق تھا۔ اسلئے اس کو ابھی بھی بھروسہ تھا، اپنے آپ پر اور سمندر کے منتھن پر۔ لیکن اسے کیا؟ جب بھی اس نے سمندر سے منتھن کر کے امرت نکالا، میں ہی اس کو پی گیا، وہ دیکھتا رہ گیا، دیکھتا اور ترستا رہ گیا، ایک ایک قطرے کو، پھر بھی اس کو لگتا تھا کہ 'ہی ون' برجستہ ہے۔

میں نے اس پر بھی بھرپور نظر ڈالی، معلوم نہیں اس نے میری آنکھوں میں کیا دیکھا کہ وہ گھبرا گیا۔ میں اس کو اپنے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اندر چلتے ہی وہ حیرت زدہ سا رہ گیا اس کی نظر ایک ایک چیز پر جم کے رہ گئی اور زبان بند ہوگئی۔ آنکھوں میں وحشت پیدا ہوئی اور اس کا جسم جو ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا زیادہ نڈھال ہوتا گیا مجھے لگا یہ بہترین موقع ہے اور میں نے اسکو چت کر دیا، وہ ایک دم نیچے گر گیا اور میں نے پائپ

(سرکنڈے کی) اس کے گلے کے ساتھ لگائی اور ایک ہی سانس میں اس کا
سارا خون پی گیا جیب سے سفید رومال نکالا اور اس سے پائپ کو صاف
کیا۔ میں نے خود ہی اپنی کارکردگی پر زوردار قہقہہ لگایا۔ ہونٹ سفید رومال
سے صاف کئے۔ لیکن یہ کرنے کے بعد بھی بھوک کا احساس ہوا، اتنا کرنے
کے بعد بھی میں نے ڈکار تک نہیں لی۔ اپنی بھوک کی شدت اور عظمت پر میں
وہیں صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگا، مگر جلدی ہی وال کلاک نے گیارہ بجائے
اور مجھے یاد آیا کہ مجھے ایک جلسے کو خطاب کرنا تھا۔

میں وہاں پہنچا تو لوگوں نے میری ان کوششوں کی خوب تعریفیں کیں
جو میں جنگل کٹوانے کی خاطر کر رہا تھا۔ میں نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ
جنگل ہماری تہذیب کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہ ہماری غریبی، پس ماندگی
اور جہالت کی نشانی ہے۔ جتنی جلدی یہ ختم کئے جائیں گے اتنی جلدی ہم قومی
وقار پالیں گے، ہمیں عزت اور رتبہ ملے گا۔۔۔۔ مگر لوگ میری تقریر نہیں
سن رہے تھے، وہ صرف میری طرف دیکھ رہے تھے۔۔۔۔ دیکھتے تھے اور
نعرے لگا رہے تھے۔۔ کھلے دل سے نعرے لگا رہے تھے۔ اس میں کوئی
خاص نکتہ نہیں تھا شاید۔۔۔۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ لوگوں
۔۔۔۔ ہمارے باشعور لوگوں کے لئے نعرے غذا ہیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا
کہ نعرے لگانے سے ان کے شعور میں توسیع ہوتی ہے، اور کچھ کا ذہنی تناؤ بھی
دور ہو جاتا ہے۔ نعروں کی گونج میرے عظیم ہونے کی گونج تھی، اپنی عظمت

دیکھکر اور جان کر کون خوش نہیں ہوتا؟ مجھے پائپ پر نظر پڑی جس پر سفید
رومال تھا، اور اس پر لال رنگ لگا تھا۔ معلوم نہیں یہ لال رنگ سیاہ کیوں نہ
ہوا تھا۔ لال، کالا، سفید۔۔۔ بات رنگ کی نہیں ہے۔۔۔ مجھے کوئی خاص
رنگ پسند نہیں ہے۔ اسی لئے میری جیب میں مختلف رنگ کے رومال ہیں،
لوگ رومال کو دیکھتے ہیں تو ان میں اور زیادہ جوش وولولہ بھر جاتا ہے۔ مگر یہ
کوئی نہیں جانتا ہے کہ رومال صرف پائپ پر انگڑائیاں لے لے کر رقاصہ کی
طرح رقص کرتا ہے، پائپ پر کسی کی نظر نہیں جاتی ہے۔ میرے لئے بنیادی
اہمیت رومال کو نہیں ہے بلکہ پائپ کو ہے۔ یہ پائپ کیا نہیں کر سکتا ہے۔ میں
اس سے فائلوں پر سوراخ کر کے قوم کی تقدیر کو سنوارتا ہوں، اور
لوگوں۔۔۔ باشعور لوگ میری ایک ایک بات کا تعویز بناتے ہیں اور تعویز
بنا بنا کر اپنی انفرادیت، اپنے اخلاق اور بھائی چارے کے گرد گاؤں کے
جنوں اور دیووں کے لگائے ہوئے شراپ کو دور کرتے ہیں۔

ابھی جلسہ ختم نہیں ہوا تھا کہ دور سے کچھ شور سنائی دیا۔ میں کچھ نہ
سمجھا۔ سب لوگ شہر کے بڑے چوک کی طرف بھاگنے لگے۔ غیر شعوری طور
میں بھی پہنچا اور میں وہاں ششدر ہو کے رہ گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار
نہیں آیا۔ وہ وہاں تقریر کر رہا تھا۔ چاروں شانے چت گرا کر میں نے اس
کے گلے کا سارا خون پی لیا تھا۔ مگر وہ وہی تھا۔۔۔ اسکی آنکھوں میں چمک
تھی، ہڈیوں کے ڈھانچے میں گوشت بھر گیا تھا، وہ لوگوں سے کہہ رہا تھا۔

لوگو۔۔۔یاد رکھو، اگر چوک میں جنگل نہیں اگایا گیا تو تمہارا وجود
کہیں نہیں رہے گا۔۔۔تم سب پر قہر نازل ہوگا۔تم سب کی شکلیں بدل
جائیں گی اور تم آدم خور بن جاو گے۔۔۔آو ہم سب جنگل تعمیر کریں گے اور
پھر دیودار کے سائے تلے بیٹھ کر بھرپور آرام کریں گے۔۔۔دیکھو۔۔۔غور
سے دیکھو۔۔۔جنگل کا ابھی صرف نام ہی لیا کہ آسمان سے نئے الہام
اترنے لگے۔دیکھو دھنک کے سات رنگ کس انداز سے اس چوک میں
امرت کی بارش کر رہے ہیں۔اب ہم قطروں کے لئے نہیں ترسیں
گے۔جنگل تعمیر کرو۔امرت ابل ابل پڑے گا، پھر سورگ کی حوریں نئے آدم
کے لئے گیت گائیں گی۔چاروں طرف ''سوز منصور'' اور راس لیلا کی موسیقی
سے عالم وجد میں آئے گا، شنگرفی شفق کو راستوں میں چھڑکا جائے گا تو مٹی
میں سے عنبر کی خوشبو آئے گی۔سوکھے ندی نالے مست شباب رقاصہ کی طرح
امنڈ آئیں گے۔پھول تمام بندشوں کو توڑ کر بھنورے کو سینے کے ساتھ لگا
دیں گے۔تاپال کی جوتے والیاں (کونشہ واجنہ) ہی مال کو دھوکا نہیں دیں
گی، تاکہ وہ ناگ راجا (ناگی رائے) کو اپنی ذات بتانے پر مجبور نہ کرے
۔۔ذات۔۔۔یہ ہماری دشمن ہے، یہ جنگل کی دشمن ہے۔۔۔مگر یاد
رکھو۔۔۔اگر جنگل نہ آ گیا۔۔۔ہم کو اپنی کھوئی ذات واپس نہیں مل سکے
گی۔خود کھو جائیں گے، لیکن کھویا ہوا پائیں گے نہیں۔پھر نیا آدم کہاں سے
جنم لے گا؟۔۔۔جنگل۔۔۔فقط جنگل ہمارا رکھوالا ہے۔۔۔ورنہ ہم اپنی

شکلیں بھی کھودیں گے اور ہم آدم خور بن جایں گے ۔۔۔"

اس کی باتوں کا کوئی اور تھانہ چھور، بے معنی ۔۔۔ بکواس اور پاگل پن ۔اسی لئے شور اٹھا اور لوگوں ۔۔۔ باشعور لوگوں نے اس پر پتھر برسائے اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔۔۔ اگرچہ اس کی بکواس سن کر میرا منہ تک سوکھ گیا تھا، پھر بھی جتنی پتھروں کی تہیں اس پر چڑھتی گئیں اتنی ہی میری مسکراہٹ کی لکیر پھیلتی گئی ۔۔۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز دبتی گئی، پھر جو بچی تھی وہ کسی فیکٹری کے شور میں ڈوب گئی ۔ چونے کی گرد آکاش تک پھیل گئی، اور لوگوں کا ہجوم پھر نعرے لگانے لگا اور میں نے اس کی قبر پر ایک جمہوری تقریر کرلی ۔باشعور لوگوں پر پھر جمہوری نظام کی اہمیت واضح کردی ۔میں نے لوگوں سے کہا، ہمارا نظام عظیم ہے۔۔۔ جمہوری نظام ۔۔۔ کیونکہ ہم میں رواداری ہے اور ہم ہر ایک کی بات اسی طرح کھلے دل سے سنتے ہیں جس طرح ہم نے اس کی بکواس سنی ۔میں نے لوگوں سے کہا اگر اس پر جنگل کا بھوت سوار نہ ہوتا تو وہ بھی آپ ہی میں سے ایک باشعور فرد ہوتا ۔

مجھے ابھی معلوم نہیں کیا کیا کہنا تھا مگر نہ جانے کیوں میرے قدموں تلے اسکی کنکریٹ کی بنی ہوئی قبر جیسے کھلنے لگی ۔ مجھے لگا کہ وہ قبر سے باہر آنے کی جدوجہد کر رہا ہے ۔مجھ پر کپکپی طاری ہوئی ۔ میری زبان میں چاک ہوگئے اور میں ہکلانے لگا ۔ میں نے اپنی تقریر کو جلدی جلدی ختم

کرتے ہوئے لوگوں سے کہا کہ سب کو چاہے کہ حکومت سے مانگ کریں کہ اس قبر پر اس کے نام پر ایک فولاد کا کارخانہ قائم کیا جانا چاہیئے اور اس کی یاد میں ایک ڈاک ٹکٹ جاری کیا جانا چاہیئے۔

اس کے بعد میں نے اپنے تمام کام ملتوی کیئے کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ قبر میں سے باہر آئے گا اور جنگل میں نگینے جڑ دے گا۔۔۔جنگل کا نام سنتے ہی میں کانپنے لگتا تھا۔ یہاں سے نکل کر میں سیدھا گھر گیا، لیکن جوں ہی میں ڈرائنگ روم کے اندر گیا، میری نظر آئینے پر پڑی، مجھے لگا یہ میں نہیں ہوں۔۔۔میری شکل ہی بدل گئی تھی۔ میں لنگور بن گیا تھا۔ اسی اثنا میں آئینہ چور چور ہو گیا اور پیچھے صرف اسکا فریم رہ گیا، میں اس کے بارے میں سوچنے لگا، یہ جو اچھا خاصا مضبوط آئینہ تھا۔۔۔مگر اب وہ رحم طلب آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔۔۔نہ۔۔۔یہ وہ نہیں تھا۔۔۔یہ جنگل تھا۔۔۔ہی ون برجستہ پھولوں سے بھرا تھا۔ اور باہر لوگوں کے گیت گونج رہے تھے۔ رنگیں چڑیوں، پوشہ نولوں اور کستوروں کی بولیاں جنگل کی حوروں کو گیت گانے کے لئے اکسا رہی تھیں۔ اتنے میں جنگل نے انگڑائی لی اور دیکھتے ہی دیکھتے جیسے یہ چھلانگ لگا کر شہر کے چوک تک پہنچ گیا۔۔۔یہ پھیلنے لگا، اور میں ششدر رہ گیا، میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔۔۔وہ معلوم نہیں کس دیودار کے سائے تلے سے نکل آیا۔۔۔میرے سامنے آیا۔۔۔میں نے پھر اس کی رحم طلب آنکھیں اور ہڈیوں کا ڈھانچہ دیکھا۔۔۔جیب سے میں نے

پائپ نکالی اور اسکے ۔گلے کے ساتھ لگائی ۔۔۔جوں ہی پائپ اسکی شہ رگ کے ساتھ لگی ، وہ ہنسنے لگا جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا، جس کے اندر قرنوں سے لاوا پک رہا تھا۔۔۔ یہ قہقہہ سن کر میں جیسے بے ہوش ہو گیا اور جب مجھے ہوش آیا۔۔۔میں نے دیکھا کہ میری شہ رگ کے ساتھ پائپ لگی ہوئی تھی۔۔۔!!

وہ

گلشن مجید

﴿گلشن مجید (۱۹۴۹ قاضی محلّہ اسلام آباد، کشمیر) نے ساتویں دہائی کے آس پاس افسانے لکھنے شروع کیے۔ وہ کشمیری زبان میں افسانوں کے علاوہ تخلیقی اور تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ وہ ادب کے جدید نظریے سے متاثر ہیں اور انہوں نے علامتی اور اساطیری انداز کے افسانے لکھے ہیں جو عام طور سے کسی کردار یا واقع کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ اکثر دیہاتی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں اور ایک ایسی دلچسپ فضا کی تعمیر کرتے ہیں جس میں کردار علامتی روپ اختیار کرتا ہے۔ گلشن مجید ابہام اور علامتوں سے کام لے کر افسانے کو معنوی جہات عطا کرتے ہیں۔ ان کے افسانے آج کے انسان کی امیدوں، ناامیدیوں، دبی خواہشوں انسانی اقدار کی گم شدگی و تلاش کی خلاقانہ تصویریں ہیں۔ ''میہ مازانکھ'' (مجھ کو نہیں جانتے)، ''میانہ خوچ کتھ'' (میرے خوف کی بات) ''سُہ'' (وہ) اسکی بہترین مثالیں ہیں۔﴾

لمبا قد غول بیابانی جیسا، سیاہ بھنوروں کا چھتہ، چولھے کی طرح دہکتی آنکھیں اور وہ میرے سامنے اچانک ایستادہ ہوا، میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

ہم آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ میں اپنے گاؤ خانے میں چھپا، آنکھوں پر ہاتھ رکھکر پکار، ''آؤ'' کا منتظر تھا۔ مجھے کھیلنا اچھا نہیں لگتا، اسی لئے میرے ساتھی مجھے ماں کا لاڈلا کہتے ہیں۔ مجھے ماں کی کہانیوں کی پریاں چھوٹی چھوٹی سونے کی چڑیاں اور طوطے بہت پسند ہیں۔ بیچ میں جب وہ چرخے کی لے کے ساتھ نہ جانے کن خوابوں اور پرستانوں کی تلاش میں کھو جاتی، اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہتے اور میں زور زور سے رونا شروع کرتا تو وہ نہ جانے کتنے بوسے دیتی اور پیار کر کے مجھے باہر کھیلنے کے لئے بھگا دیتی۔

'' جاؤ میرا بیٹا، شاباش میرا لال، اٹھو اٹھو، شاباش، اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈنے نکلتا،

''آنکھوں میں کیا ہے؟'' سونے کا انڈا'

''آنکھیں کھائے گا نیولا اگر ادھر دیکھو گے''

''آؤ'' دور کہیں سے یہ آواز آئی تو وہ اچانک میرے سامنے ایستادہ ہو گیا، غول بیابانی! میرے منہ سے چیخ نکل گئی ''ماں''

صبح ندی کے کنارے پر سب ساتھیوں نے مجھ پر طعنے کسے، انکے

قہقہوں کے درمیان میں نے سب سن لیا۔

''اب وہ کہاں ہے''؟

''سونہ چاچا کے گھر میں، کل اس نے اس کو بہت مارا پھر پچھتایا اور اسے اپنے گھر لے گیا''۔

مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ میں واقعی ماں کا لاڈلا ہی نکلا۔ اگر میں بزدل نہ ہوتا تو اس مسافر کی اتنی مار پیٹ نہیں نا ہوتی۔ اس نے کہا ہے کہ وہ دور جنگلوں میں کسی گاؤں کا ہے، جو اس گاؤں کی طرح بڑا گاؤں تھا معلوم نہیں کہ اب وہ وہاں اکیلا ہی کیوں رہ گیا تھا۔

آج اتوار تھا اور ہم سب سونہ چاچا کے یہاں دوڑے دوڑے گئے۔ وہاں بہت سے جوانوں اور بوڑھوں نے پہلے ہی اسے گھیر کے رکھا تھا۔ میری سمجھ میں اسکی ایک بات بھی نہیں آئی، صرف جب گاؤں کے بڑے بزرگ کبھی اسکی کسی بات پر قہقہہ لگاتے تو میں بھی اپنے باقی ساتھیوں کی طرف دیکھ کر ہنستا۔ کبھی میں خود ہی ہنس دیتا۔ چھوٹا سر ''سونہ پچر'' (سنہری رنگ کا ایک پرندہ) کے برابر، بڑا سا میلا کن ٹوپ کانوں تک پہنے، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، مونچھیں منڈی ہوئیں، سیاہ دھاڑی، موسم سرما کی رات جیسا چہرہ۔۔۔ شام کو میں نے اپنی ماں سے کرید کرید کر پوچھا،

''وہ کہتا ہے کہ میں اپنے گاؤں سے بہت پرانی چیزیں ڈھونڈنے آیا ہوں۔ اب تک کہیں بھی ایسی چیزیں اسے نہیں ملیں۔ اسلئے بے چارہ

دربدر پھر رہا تھا''

مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ کاش ہمارے گاؤں میں مل جاتے۔ کیا معلوم یہ تاج الملوک اپنے باپ کے اندھے پن کا علاج ڈھونڈنے نکلا ہو۔ مگر کیا تاج الملوک ایسا ہوگا؟ وہ شہزادہ ہے۔ معلوم نہیں یہ کون ہے! اور مجھے شک ہوا یہ نئے چراغوں کے بدلے پرانے چراغ خریدنے تو نہیں نکلا ہے؟ جادوگر! مجھے بہت غصّہ آیا۔ دوسرے دن وہ ہمارے یہاں آیا، اجازت لینے کہ وہ ہمارے پرانے گاوخانے میں رہنا چاہتا ہے۔ میں نے ہمت کی اور ڈرتے ہوئے اسے پوچھا

''کیا تم نئے چراغوں کے بدلے پرانے چراغ خریدتے ہو''

اس نے میری طرف دیکھا اور ایک زوردار قہقہہ مارا۔ میں نے ماں کی طرف دیکھا اور دیکھا وہ بھی ہنس رہی تھی۔ ''چپ کرو، نادان، جاؤ، تختی لکھ لو''، میں نے ماں کے پیراہن کا دامن پکڑ لیا۔۔۔

''بچہ ہی تو ہے۔ جو آپ کہیں گی وہ اسکو اس عمر میں سچ ہی لگے گا۔''

اچھا تو ماں مجھے جھوٹی باتیں بھی بادشاہوں کی کہانیوں میں سناتی ہے۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا لگا، ساگ کے پودے کے برابر۔ میں ماں کے چہرے کو دیکھتا رہا، کیا ماں مجھے غلط کہے گی؟ پتا نہیں کس گاؤں کا ہے، جنگلی آدمی۔ اس کو کیا معلوم ہے کہ ہی مال کے چشمے پر ہی مال کی آہ و فغان میری ماں نے اپنے کانوں سے سنی ہے۔ کیا یہ جھوٹ ہے؟ میں نے محسوس کیا کہ میں اس سے

بہت بڑا ہوں۔

وہ کوئی کام کاج نہیں کر رہا تھا۔ ایک لمبی چھڑی ہاتھ میں لے کر دن بھر صرف گھومتا رہتا، ایک گھر سے دوسرے گھر، ایک پگڈنڈی سے دوسری پگڈنڈی۔ کھانے پینے کی اسے کوئی فکر نہ تھی۔ اس کا اپنا گھوڑا تھا جس پر وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑے لے کر آیا تھا وہ بھی وحشی اور بے قابو تھا۔ اس نے سب کو ستایا، تو ایک دن اس کو شیر کھا گیا۔ لیکن اسے اس کا ذرا بھی دُکھ نہیں ہوا۔ ''تھا تو کھایا، اب کھائے تو اُس کو مرد میدان مانونگا''

میٹھی اور پیاری، سیدھی سادھی باتوں سے وہ مزے سے اپنا دن گزارتا، سب اس کو پسند کرتے تھے۔ بات کرتے ہوئے بھی اسکی وہ مگر چھوٹی آنکھیں ہر ایک میں اور ہر چیز میں کچھ تلاش کرتی رہتیں۔ وہ 'کچھ' کیا ہے؟ سب خود اپنے آپ اور گرد و پیش پر گہری نظر ڈال کر اس کی طرف دیکھتے، اور اسکی یہ حالت دیکھ کر اس پر ترس کھاتے۔ '' نہ جانے اس بے چارے نے کونسا درد پال رکھا ہے۔ ہمیں بھی کہتا تو شاید اس کا دل ہلکا ہو جاتا'' لیکن اس نے اپنا درد اپنے ہی اندر چھپا کے رکھا، سب لوگ اس کی عزت کرتے تھے، ہر مشورے میں شریک رکھتے حالانکہ کرتے وہی جو ان کی مرضی ہوتی۔

شروع میں وہ خوش تھا۔ مگر جب کھیتوں کا کام بہت بڑھ گیا اور لوگ اس میں مصروف ہو گئے تو وہ اکیلا رہ گیا، ویران مسجد کے جن کی طرح، کام تو

کچھ تھا نہیں۔شام کو کسان تھک ہار کر گھر آجاتے اور گہری نیند سو جا
تے۔آہستہ آہستہ بزرگوں کی جگہ ہم بچوں نے لی۔اب جوں ہی ہم شام کو
کھیلنے نکلتے وہ ہم کو اپنے پاس بلاتا اور پھر اچھی اچھی باتیں سناتا۔کبھی ہم بھی
ندیوں کی باڑ باندھنے جاتے تو وہ اتنی دیر تک تمباکو پیتا۔دن گذرتے
گئے۔کبھی ہمیں باڑ باندھتے باندھتے دیر ہو جاتی، ہم ایک دوسرے پر پانی
پھینکتے، آنکھ مچولی کھیلتے یا ایک دوسرے کے ساتھ سر ٹکراتے اور اس کی باتوں
کا مذاق اڑاتے اور ہنستے۔جب ہمیں روز دیر ہونے لگی تو وہ بھی ایک دن
ہمارے ساتھ آیا۔اس دن سب خوش ہو گئے۔ہم نے اس کو بھی باڑ باندھنا
اور دام بچھانا سکھایا۔اس نے کہا اس کے گاؤں میں ایسی ندیاں نہیں تھیں
جن کو باڑ باندھی جاتی، وہاں پانی چٹانوں پر سے تیزی کے ساتھ اچھل اچھل
کر بہتا ہے اور یخ کی طرح سرد ہوتا ہے۔

لوگ اب اس کی باتوں پر کان نہیں دھرتے تھے اگر وہ کسی کو بلاتا
بھی تو وہ ان سنی کرتا۔آخر کام بھی بہت زیادہ تھا، صبح سے شام تک، اسکی
باتیں سننے کے لئے فرصت کہاں سے لاتے؟'' ہاں جی بیکار آدمی ہے اور
صرف کھاتا ہے، اسکو کیا فکر ہے۔ان گوجروں کو عقل ہے کہاں، ذرا بھی
نہیں۔ہو نہ ہو جیسے کوئی ولی ہو'' لیکن ان باتوں پر توجہ کئے بغیر ہی وہ ہمارے
لئے باڑ باندھنے کا کام کر لیتا۔وہ دام بچھانے میں ماہر تھا۔کم سے کم ہم بچے
اس سے خوش تھے۔وہ بھی ہمارے ساتھ گھل مل گیا تھا۔

فصل گھر آگئی اور آخر کار کوٹھوں میں سما گئی۔ بیدزاروں میں پھر میلے لگنے لگے لیکن وہ ہم سے دور ہونے لگا۔ حالانکہ اس نے شروع میں ہمارے ان میلوں اور رسموں کی نکتہ چینی کی لیکن کچھ دیر بعد وہ بھی ان کا عادی ہو گیا تھا۔ اس نے مکھی مار سے ستار بنایا اور سب کے بیچ ناچنے لگا۔ اسکو نہ جانے کتنے گانے یاد تھے۔ ایسے گانے جن میں انسان کھو جاتا، اپنا گھر بار بھول جاتا اور ایک عجیب طرح کے پیار و محبت کے سوتے پھوٹ پڑتے۔

اس جاڑے میں شدید برف باری ہوئی۔ لوگوں نے مکانوں کی چھتوں سے تین تین بار برف گرائی۔ چھت سے برف گرانے میں وہ ماہر تھا۔ اس نے سب کی مدد کی۔ آخر کار جاڑے نے اسکو بھی نہیں بخشا، بہار کی آمد پر جب منڈیروں اور کھیتوں سے خودرو گھاس نکالی جانے لگی بیساکھیاں اس کا سہارا بن گئی تھیں۔ وہ ان کے بغیر ایک قدم چل نہیں سکتا تھا آنکھیں اور زیادہ اندر دھنس گئی تھیں۔ پہلے سب چائے اور کھانا اس کے لئے بھیجا کرتے تھے، مگر اب وہ خود ہی ٹھک ٹھک کرتے ہوئے چائے اور کھانے کے اوقات پر پہنچ جایا کرتا سب اسے لگ بھگ بھول ہی گئے تھے، یا ان کو اب وہ اپنا جیسا ہی لگتا تھا یا گاوں کا کوئی لڑکا جیسا ہی اور ہمیں بھی اب اسکی زیادہ ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ امتحان سر پر کھڑا تھا نا! کس کے پاس اتنی فرصت تھی۔ گاوں میں اب صرف میری ماں ہی اسکو ٹھیک سے کھلاتی پلاتی تھی، وہ بھی کہتا تھا کہ میں یہاں صرف اس بہن کے لئے ٹھہرا ہوں، ورنہ

نکل گیا ہوتا۔ وہ صرف گاوخانے سے ہمارے گھر تک اور وہاں سے گاوخانے تک ہی اب محدود ہو کے رہ گیا۔ گاوں والے اسکو بھول گئے اور اس نے بھی گاوں والوں کو چھوڑ دیا۔

اس سال موسم بہار میں شدید برف باری ہوئی۔ جاڑا واپس آیا، سب کونوں میں دبک گئے۔ وہ ایک دن صبح سویرے آیا اور دروازے پر ماں کو پکارا، ہم دونوں ماں بیٹے نکلے۔ بھاری برف باری ہورہی تھی۔ وہ کن ٹوپ کانوں تک پہنے، کاندھے پر ایک تھیلہ ڈالے برآمدے پر کھڑا تھا اور جانے کے لئے تیار تھا۔

اچھا بہن اجازت دو۔ میں جارہا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور اس نے بیساکھیاں چھوڑ دی تھیں۔

ریڈیو علان سے آج تک

انیس ہمدانی

انیس ہمدانی (۱۹۵۵-۱۹۸۹، سرینگر) کشمیر کے ایک میر واعظ ہمدانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو وراثت میں علمی اور ادبی ماحول ملا تھا، کم عمری میں ہی انہوں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ پہلے اردو میں لکھتے تھے لیکن جلد کشمیری زبان کی طرف مائل ہو گئے۔ انہوں نے افسانے اور ڈرامے لکھے ہیں، ریڈیو کشمیر سے ان کے افسانے اور ڈرامے نشر ہوتے تھے۔ ان کے افسانے ''شیرازہ'' میں چھپتے تھے اور وہ ادبی محفلوں میں پڑھتے تھے، خاص طور سے ریاستی کلچرل اکاڈمی کی افسانہ محفلوں میں۔ انہوں نے اپنا آخری افسانہ ۲۲ اگست ۱۹۸۹ کو کلچرل اکاڈمی کی طرف سے بارہ مولہ میں منعقد کی گئی محفل افسانہ میں پڑھا، عنوان تھا ''تمہ نامعلوم جاے ہند سۂ قبرستان''، (اس نامعلوم جگہ کا وہ قبرستان)۔ انیس ہمدانی ایک ذہین اور حساس فنکار تھے، وہ دوردرشن، سرینگر میں اسسٹنٹ ایڈیٹر اور معروف براڈ کاسٹر تھے۔ ۱۹۹۱ میں ان کی دوسری برسی کے موقع پر ان کا افسانوی مجموعہ'' وجود تہ ژھائے'' (وجود اور سایہ) شائع ہوا۔

''ایک چہرہ جس پر دو آنکھوں کے بجائے ماتھے پر صرف ایک آنکھ تھی جو خون کی طرح سرخ تھی، اس کی زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی اور اس سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔''

یہ سن کر میں کھڑا ہو گیا، کمرے سے باہر آ گیا اور اس کے پاس گیا، یہ جان کر بھی کہ رات گئے کا وقت ہے۔ میں نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا، وہ بھی جلدی جلدی اٹھا اور دروازہ کھول دیا اور پوچھ بیٹھا

''بات کیا ہے، تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ اور اتنی رات گئے، خیریت ہے؟''

''تمہیں نہیں معلوم'' میں نے پوچھا

''کیا''، اس نے کہا

''کہتے ہے اس کے آنے کا وقت آ گیا ہے، جس کے، دو آنکھوں کے بجائے ماتھے پر صرف ایک آنکھ ہوگی، وہ خون کی طرح سرخ ہوگی، زبان باہر کو نکلی ہوگی، جس سے خون کی دھار بہہ رہی ہوگی''

''تم سے کس نے کہا'' اس نے حیران ہو کر پوچھا

''ریڈیو پر علان ہوا''

''اچھا'' وہ گھبرایا نہیں

''تم نے نہیں سنا'' میں نے پوچھا

''اگر سن لیا ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتا؟ مجھے اس علان کے بارے

میں کوئی علم نہیں، کیا تم نے خود سن لیا؟'' اس نے کہا

''ہاں میں نے ابھی سن لیا اور سنتے ہی تمہارے پاس آ گیا۔ اس سے پہلے کبھی یہ اعلان ہوا ہو، مجھے معلوم نہیں۔ میرے خیال میں یہ اعلان ابھی پہلی بار ہوا ہے، اسلئے کہ میں نے ابھی سنا''

''نہیں تمہیں غلط فہمی ہے۔ اعلان کا اصل وقت وہ ہے جب پہلی بار ہوا، نہ کہ وہ جب تم نے سنا، اس کی غلطی نہیں جس نے اعلان کیا بلکہ تمہاری ہے کیوں کہ تم نے نہیں سنا'' اس نے مجھے قائل کرتے ہوئے کہا، اسلئے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے پھر کہا،

''خاموش کیوں ہو گئے، یہ خاموش ہو جانے کا وقت نہیں ہے، کہو اعلان میں اور کیا کیا کہا گیا''

''کہا کہ لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے باہر نہ آئے اور کھڑکیاں اور دروازے بند رکھے''

''اس کے بعد کیا ہوا'' اس نے پوچھا

''یہ دیکھنے کے لئے کہ لوگ کیا کر رہے ہیں میں دروازے سے باہر آ گیا''

''تم نے کیا دیکھا؟'' اس نے پوچھا

''کچھ بھی بدلا نہیں تھا، سب اپنے اپنے کام میں پہلے کی طرح ہی مصروف تھے جیسے کچھ بھی نہ ہوا تھا، کسی نے کچھ بھی نہ کہا تھا، کسی نے کچھ بھی

نہ سنا تھا''

''لوگ گھروں سے باہر آ گئے تھے؟'' اس نے پوچھا

''نہیں'' میں نے کہا

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں واپس گھر میں داخل ہوا، سوچا کہیں میں نے غلط تو نہیں سنا، اسلئے میں نے ریڈیو پھر آن کیا۔ اعلان ابھی بھی ہو رہا تھا'' لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ گھروں سے باہر نہ آئیں، دروازے اور کھڑکیاں بھی بند رکھیں'' مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ میں غلط نہیں تھا اسی لئے میں نے بھی ویسا ہی کیا۔ اور اب تمہارے پاس آ گیا'' میں نے وضاحت کی تا کہ وہ سمجھ جائے۔

''تو پھر اس میں گھبرانے کی بات کیا ہے۔ آؤ اندر آ جاؤ، دروازے پر کھڑے کیوں ہو'' وہ کمرے میں داخل ہو گیا اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور کہا'' کھول دو کھڑکی، تم دیکھو گے کہ ابھی بھی کچھ نہیں ہوا ہے''

''نہیں ایسا نہیں کرنا'' اعلان میں کھڑکی کھولنے سے منع کیا گیا ہے''

میں نے اسکو سمجھانے کی کوشش کی۔

ٹھیک ہے جب تم نہیں چاہتے ہو، میں مجبور کیوں کرونگا، اچھا بجلی بند کریں گے'' رات بہت ہو گئی ہے نا۔۔۔''، شاید اس کے سونے کا وقت

ہو گیا تھا میں اس کی یہ بات سن کر گھبرا سا گیا اسلئے کہا،

''میں اندھیرے سے ڈرتا ہوں۔۔۔اور پھر کیسے یقین کروں گا کہ صبح روشنی ہوگی''

میری بات سن کر وہ اسطرح ہنس پڑا جیسے میں جھوٹ بول رہا تھا، اور کہا'

''کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہ بھی پوچھنے والی بات ہے'' ''میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں صبح ہونے پر کیا ہوگا؟ نہ تمہیں معلوم ہے اور نہ ہی سوچ سکو گے'' میں نے کہا

''اب مجھے ہی معلوم نہیں۔ تم نے کھڑکی کھولنے نہیں دی، صبح تک انتظار کرنے کے لئے تیار نہیں ہو اور اندھیرے سے بھی ڈرتے ہو'

پھر اگر میں کہو گا، یقین کرو گے؟''

''یقین کیوں نہیں کرونگا؟ کہو'' میں نے کہا

''روشنی اور تاریکی، صرف خود محسوس کرنے سے ہے'' وہ کہہ رہا تھا اور میں بت بنا اسکو دیکھتا رہا، اور جب میں نے کچھ نہ کہا تو اس نے بالکل بدلے ہوئے انداز میں پوچھا

''کیا تم مجھ سے ڈرتے ہو''

''تم سے کیوں ڈروں'' میں نے ذرا مسکرا کر کہا

''اگر میں کہوں کہ وہ میں ہی ہوں، پھر مجھ سے ڈرو گے؟''

''کون'' میں نے پوچھا

''وہی جس کے بارے میں ریڈیو پر علان ہوا''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے'' میں نے کہا

اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی کے ساتھ کہا ''وہ میں ہی ہوں؟ مگر اس کے ذمہ دار وہی ہیں''

یہ کہتے ہوئے اس کی دونوں آنکھیں ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئیں، ناک غائب ہوگئی اس کی جگہ ہموار ہوگئی اور ماتھے پر صرف ایک خونین آنکھ نمودار ہوگئی اور آہستہ آہستہ اس کی زبان باہر نکلنے لگی۔ میں جھٹ سے مڑ کر بھاگنے لگا، بھاگتے بھاگتے پیچھے سے اس کی آواز سنائی دی۔

''بے وقوف روشنی اور تاریکی صرف خود محسوس کرنے سے ہے۔''

باہر لوگ گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر رہے تھے۔

سپیڈ بریکر

فاروق فیاض

﴿فاروق فیاض (۱۹۵۴) افسانہ نگاروں کی نئی پود جو انیسویں صدی کے آٹھویں دہے سے افسانے لکھ رہی ہے میں شامل ہیں، ان کے افسانے کشمیری زبان کے مختلف رسالوں میں چھپتے ہیں۔ وہ افسانوں میں فنی دروبست کا خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے کشمیری لوک ادب پر اہم تحقیقی کام کیا ہے۔

''زبان ادب تہ تواریخ'' ان کی ایک اور تحقیقی تصنیف ہے۔ ''سپیڈ بریکر'' ان کا ایک نمائندہ افسانہ ہے۔﴾

آج پھر میرا وجود بکھر بکھر سا گیا۔ بہت کوشش کی میں نے کہ بس میں مجھے ڈرائیور کے پیچھے سیٹ نہ ملے، مگر وہی ہوا، آج پھر غیر شعوری طور پر میری نظر بس میں ڈرائیور کے سامنے لگے آئینے پر پڑی مجھے اپنا چہرہ بہت بدصورت لگا، آج تک میں بہت کوشش کرتا رہا کہ میری نظر آئینے پر نہ پڑے، اسلئے میں ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں بدصورت ہوں کہ نہیں، وہ میں خود نہیں کہہ سکتا۔ مگر جوں ہی میری نظر آئینے پر پڑتی تھی، مجھے تمام گذرے ہوئے پل یاد آتے تھے، یہی پل مجھے بدصورتی کا احساس دلاتے تھے۔

میں اب تک بہت کوشش کرتا تھا، کہ یہ گذرے ہوئے لمحے کسی دوسری صورت میں جی نہ اٹھیں، جن میں مجھے پہلی بار جینے کا احساس ہوا تھا۔ آج مجھے ایک ایک انگ زخموں سے چور لگتا تھا، معلوم نہیں مجھے کیوں آج اپنا آپ بھی اجنبی لگ رہا تھا، میں نے خود سے کئی سوال کیئے، لیکن ایک کا بھی جواب نہ دے سکا، دے بھی سکتا تو کیونکر، میں اپنے آپ سے دور ہو گیا تھا، اور یہ دوری کوئی معمولی بات نہیں تھی، یہ دوری جاننے اور اپنانے کے بیچ ایک خلیج تھی مگر جس کا احساس ہی سرد ہو گیا ہو اور جس میں اپنانے کی شکتی معذور ہو گئی ہو، اس کے لئے یہ "خلیج" کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا تھا اور ساتھ ہی دوسرا سوال بھی کیا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر بات کوئی معنی رکھتی ہو، اگر کسی سوال کا جواب نہ ملے تو کیا

سانس رُک جائے گی۔؟

''ارے صائبہ تم کیوں آج بھگوان نہ کرے، پریشان سے لگ رہے ہو، بھگوان پر چھوڑ دو، نوکری ہی کرتے ہیں یا اپنے آپ کو بھی سرکار کے ہاتھوں بیچ دیا ہے؟ ویسے آج ہی یہ بس لیٹ ہو جائے گی، آج ہی صاحب کو دورے پر آنا ہے نا۔ پھر بھی پریشانی کا ہے کی، دیکھ دیوی ماتا کیا کرتی ہے۔۔۔''

میں نے سوچا کہ میں جانکی ناتھ کی ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دونگا۔ مگر ''دیوی'' کا نام سن کر میری جمی ہوئی سوچ جیسے پگھلنے لگی، میں نے سیٹ سے سر اوپر اٹھایا اور سوچا کہ جانکی ناتھ کے سوال کا جواب دوں، لیکن وہ کنڈکٹر کے ساتھ چند پیسوں کے لئے مجادلہ کر رہا تھا۔

پھر ایک بار میری نظر آئینے پر پڑی اور میں نے جلدی سے سر پھیر کر سیٹ پر رکھ دیا۔ ''دیوی'' ۔۔۔شیرین اور ٹھنڈک دینے والا لفظ۔۔۔زندگی اور معنی کا ملاپ، خیال اور احساس کا سنگم۔۔۔''اس چشمے کے پانی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے نرملا؟''

''یہ پاک اور پوتر ہے۔ پاپوں کو شما کرنے والا اور دل کو ٹھنڈک دینے والا۔۔۔''

نرملا کا یہ جواب سن کر میں بہت خوش ہوا۔ اور میں نے ایک بار پھر پوچھا۔ ''دیکھ رہی ہو کہ ہمارے سائے کس طرح اس پانی میں ڈوبتے اور

پھیلتے ہیں''۔

میں نے سوچا کہ کہہ دوں، ان کا انت ان کی موت ہے، اس کا دل رکھنے کے لئے میں نے کہا'' یہ دیوی کے چرنوں تک پہنچ کر اور ان کا بوسا لے کر اپنے انت کو پہنچیں گے''۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوگئی اور ایک نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی، '' صائبہ! کیا تم اس لڑکے کو جانتے ہو''؟ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا'' یہ وجہ ہے، جن کے ساتھ میرا۔۔۔'' پانی میں ہمارے سائے انگڑائی لے کر پھیل کر دیوی کے چرنوں پر پہنچ کر اپنے انت کو پہنچ چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے پوچھوں کہ اس کے ساتھ کون سا رشتہ ہونے والا ہے۔؟

'' صائبہ دیکھ رہے ہو یہ کنڈکٹر کتنے برے ہوتے ہیں، یہ جان کر بھی کہ ڈیلی پسنجر ہیں، میرے پاس دس پیسے کم تھے، دیکھا کس طرح مجھے جھگڑ لیا بھگوان جانے صبح نکلتے وقت کس کا منہ دیکھا تھا، دیکھ یہ موا بھی میرے ہی گلے پڑ گیا'' لفظ'' موا'' سن کر میں زیرلب مسکرایا، اس لئے کہ جانکی ناتھ نے یہ بدلفظ آہستہ سے کہا، شاید اسلئے کہ کنڈکٹر نے سن لیا تو ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ جانکی ناتھ نے میری مسکراہٹ کے انداز کو بھانپ لیا اور بات کاٹ لی اور کھڑکی سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، '' سنو صائبہ کیا تم اس پہاڑی پر کبھی گئے ہو۔ کہتے ہیں وہاں ایک باباجی ہے، مانو قلندر رہے قلندر۔

کہتے ہیں شوِ بھگت ہے''

جانکی ناتھ کی باتیں سن کر میں نے سیٹ سے سر اٹھایا کھڑکی کے شیشے سے باہر پہاڑی کی طرف نظر اٹھائی، ایک بار میری نظر ڈرائیور کے سامنے لگے آئینے پر پڑی اور میں نے سر سیٹ پر ڈال دیا۔

شوِ بھگت کا نام سن کر مجھے وہ بابا جی یاد آیا جو مجھے امرناتھ جی کی یاترا میں پشّو پہاڑی پر ملا تھا۔ کتنی شانتی اور سکون اس کے چہرے پر نظر آ رہا تھا، پشّو پہاڑی پر چڑھتے چڑھتے میں جس پسینے میں نہایا اور جو تھکان میری رگ رگ میں اتر گئی تھی، وہ بابا جی کے پوتر وچاروں سے ختم ہونے لگی۔ آج میں شاید زندگی میں پہلی بار وہ شبد سن رہا تھا۔ جن کے معنی تلاش کرنے کا احساس مجھ میں جاگ گیا تھا، میں نے لمبی سرد آہ کھینچی، یہ میرے مطمئن ہونے کا اظہار تھا، بابا جی نے میرا سر اپنی گود میں رکھا، میرے ماتھے کو چوما اور اپنی جیب سے ایک خوبصورت تلسی کی مالا نکالی اور مجھے سونپ دی اور کہا یہ ہر وقت گلے میں پہنے رکھنا اور تاکید کی'' گوشت نہیں کھانا''۔ میں نے اپنی طرف سے کوشش کی تھی کہ بابا جی سے پوچھوں کہ کیا گوشت کھانا ترک کرنا ضروری ہے، لیکن میں یہ سوال ہونٹوں تک لا کر بھی پوچھ نہ سکا، آج میں سمجھ رہا ہوں کہ بابا جی وہ بھانپ گئے تھے ، جو مجھے زندگی میں بھگتنا تھا وہ لمحہ اس کے سامنے تھا جس نے مجھے بعد میں شراپ دیا تھا اور یہ شراپ کس لمحے کی دین ہے، یہ سوال آج بھی میرے ذہن کو بے چین رکھے ہوئے ہے اور دل

کو مسلتا ہے۔ بہت دیر تک مجھے وہ تلسی مالا با با جی کے سندر اور پیارے
چہرے کی یاد دلاتی رہی۔ مگر کافی عرصہ گزرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ وہ
مالا میرے جسم میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے مشورہ
کیا تو اس نے کہا کہ تمہیں الرجی ہوگئی ہے اور یہ اس تلسی مالا کا نتیجہ ہے، اس
کو گلے سے اتار دو۔ ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے بعد میں سیدھے قصائی کی
دکان پر گیا اور ایک پاو کلیجی خرید لی، آج مجھے بہت مدت کے بعد گوشت کھانا
تھا، مجھے اپنے پر ہنسی آئی اور میں نے مالا کو گلے سے اتار دیا اور کیل پر ٹانگ
دیا۔ کلیجی کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے میری نظر مالا پر پڑی میں نے ایک نظر
تھال میں پڑی کلیجی کے ٹکڑوں پر ڈالی اور ایک کیل پر ٹنگی مالا پر، مالا کے
دانے گول تھے، لیکن کلیجی کے چکور ٹکڑے بھی مجھے گول نظر آئے مجھے اس پر
غصہ آیا، شاید اسلئے کہ اس نے میرے سارے شریر کو داغدار بنایا تھا، میں اٹھا
اور اس مالا کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ مالا کے دانے سارے آنگن میں بکھر
گئے۔۔۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ بکھرے ہوئے دانے ٹکٹکی باندھ کر مجھے تک
رہے ہیں، کچھ یاد دلا رہے ہیں، مگر میں ان کی خاموشی کا کوئی مطلب نہ نکال
سکا۔ بہت کوشش کرنے کے بعد میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

''صابہ تم کن خیالوں میں گم ہو؟ کیا تم ٹھیک ہو؟ باہر دیکھو سرسوں کیا
پھولی ہے! آج میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ یہیں سے سال بھر کے لئے کھانے
کا تیل لے جاونگا، کیا وہ ٹھیک نہیں رہے گا؟'' جانکی ناتھ کے سوال کا میں

نے کوئی جواب نہیں دیا، شاید وہ مجھ سے جواب چاہتا بھی نہیں تھا، اسلئے اس
نے اپنا سوال دھرایا نہیں۔ میں نے سیٹ سے اپنا سر اٹھایا، سرسوں کے پھول
واقعی ہوا کے جھونکوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے، مگر میں زیادہ دیر تک وہ
دیکھ نہیں سکا اسلئے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری نظر بھولے سے بھی ڈرائیور کی
سیٹ کے آگے لگے آئینے پر پڑے۔ میں نے لمبی سانس لی اور کھڑکی کے
شیشے پر چھوڑی، شیشہ دھندلا گیا، ہر طرف سے سب کچھ دھندلا گیا، جی
کڑا کر کے میں نے ڈرائیور کے سامنے لگے آئینے پر نظر ڈالی، وہ بھی دھندلا
گیا تھا۔ مجھے اپنی صورت اس میں نظر نہیں آئی، لمبی آہ کھینچی، بہت خوش ہوا،
جانکی ناتھ بھی مجھے دھندلا نظر آیا، حالانکہ وہ میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا، میں
نے سوچا جانکی ناتھ سے پوچھوں تمہیں بھی سب کچھ دھندلا نظر آتا ہے؟ جوں
ہی میں نے جانکی ناتھ سے سوال کرنا چاہا کہ گاڑی کو زبردست جھٹکا لگا، میں
آگے والی سیٹ کی طرف لڑھک گیا، جانکی ناتھ کا چشمہ چہرے سے لڑھک
کر میرے پاؤں پر آگرا۔ ''براہو ان سپیڈ بریکروں کا، ہر راستے پر بنائے
گئے ہیں اور پھر یہ ڈرائیور بھی دیکھ کر نہیں چلتے، دیکھ میرا کیا حال ہوگیا،
بھگوان قسم میرا دل ہی بیٹھ گیا''

میں نے جانکی ناتھ کے چہرے پر ایک نظر ڈالی، واقعی جیسے ساری
پھولی ہوئی سرسوں کی زردی اس کے چہرے پر مل دی گئی ہو، ڈرائیور کے
آگے لگے آئینے پر نظر ڈالی، آئینہ بس کے جھٹکے سے دو ٹکڑے ہوگیا تھا، مجھے

اپنا چہرہ برابر دو حصوں میں نظر آیا۔ کھڑکی کے شیشے پر دھند پانی کے قطروں میں تبدیل ہوگئی تھی اور یہ پانی کے قطرے بے ترتیبی کے ساتھ شیشے پر بکھر گئے تھے بالکل اس طرح جس طرح تلسی کی مالا کے دانے آنگن میں بکھرے پڑے ہیں،

''اٹھو یار، آج پہلے سے زیادہ دیر ہوگئی کہیں بس میں ہی بیٹھنے کا ارادہ تو نہیں''۔ جانکی ناتھ کے سوال کا جواب دئے بغیر گاڑی سے اترا اور اسکول کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔

سایہ

ناصر منصور

ناصر منصور (۱۹۵۳ نوشہرہ، سرینگر) نئی نسل کے ایک ابھرتے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے کشمیری زبان کے رسالوں ''شیرازہ''، ''خبر و نظر''، ''آلو'' میں چھپتے ہیں۔ انہوں نے کم وقت میں ہی ایک تخلیقی فن کار کی حیثیت سے تنقیدی اور تحقیقی کتابوں اور مضامین میں جگہ حاصل کی ہے۔ وہ علامتی اور تخیلی افسانے لکھتے ہیں۔ ''ژھاے'' (سایہ) ان کا مشہور افسانہ ہے۔

جوں ہی میں نے کوچے سے باہر چوک میں قدم رکھا میں کسی سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔ وہ میرے پاس آیا اور اس نے مجھ کو اٹھایا۔ اٹھتے ہوئے میں نے اسکے سراپا پر نظر ڈالی۔ وہ لگ بھگ میرا ہم عمر تھا اور مجھ جیسا۔ ہاں اسکی آنکھوں میں عجیب چمک تھی اور ہونٹوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ!۔

"لگی تو نہیں"، اس نے ذرا مسکراتے ہوئے پوچھا

مجھے بات کرنے کا اسکا انداز ناگوار گزرا، اسی لئے میں نے منہ دوسری طرف پھیر کر آگے کا راستہ لیا،

"شاید تم نامعلوم سوچوں میں غرق تھے"، اس نے اسی انداز سے پھر بات کی اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہ میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا رہا۔ میں خاموش رہا اور چوک میں پہنچ کر چاروں طرف نظر دوڑائی، وہاں گاڑیوں موٹروں، سائیکلوں، سکوٹروں اور پیدل چلنے والوں کی چھل پہل تھی۔ نوجوان چوک میں چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور اپنی دنیا میں مست تھے۔ شاید اپنے ارمانوں کا ثبات دیکھنا چاہتے تھے یا ان کا خون ہوتا ہوا۔ یا۔۔۔۔ "تمہاری جیب میں سگرٹ تو نہیں" اس نے مجھ سے سگرٹ اس طرح مانگا جیسے اسے میرے ساتھ عمر بھر کی جان پہچان تھی۔ میں نے پھر اسکو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ میلی، لال آنکھیں، بال پریشان اور ہونٹوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ لے کر وہ مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں زیادہ دیر تک اسکی طرف دیکھ نہ سکا۔ اسی لئے جلد جلد میں نے جیب میں سے سگرٹ

نکالا اور اسے دے دیا۔ جلدی میں نے ایک اپنے ہونٹوں میں بھی رکھ کر جلایا اور میں چوک سے دوسری طرف کو نکل گیا۔

مجھے محسوس ہوا کہ وہ سائے کی طرح میرے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے۔ اسی سے میں زیادہ عاجز ہوگیا۔ میں خاموشی سے ایک رستوران میں داخل ہوا اور سڑک کی طرف کھلتی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ ذرا سکون کا سانس لیا اور کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ چوک میں لوگوں کا ازدحام تھا، کچھ آرہے تھے اور کچھ جارہے تھے، کچھ ہنستے تھے اور کچھ رونی صورت لئے ہوئے تھے، کچھ خاموش تھے اور کچھ بولتے چالتے، کچھ اس طرف سے آرہے تھے اور کچھ اس طرف سے جارہے تھے۔ نوجوان ٹولیوں میں فٹ پاتھ پر بیٹھے چوک کے زاویوں کو دیکھ رہے تھے یا چلنے والوں کے انداز رفتار کو ماپ رہے تھے اور ہنستے تھے۔

''تمھاری ماچس کی ڈبیہ میرے پاس رہ گئی ہے''

میں نے اسکو اپنے سامنے کھڑا دیکھا، ہاتھ میں ماچس کی ڈبیہ لے کر اور میں نے غصے کے ساتھ اس کے ہاتھ سے ماچس کی ڈبیہ چھین لی اور پھر کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔

''وہاں وہی ہے جو کل تھا، پرسوں تھا اور شاید کل بھی ہوگا'' یہ کہتے ہوئے وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا

''تم کون ہو اور میرے ساتھ تمہیں کیا کام ہے؟''

میں نے اسے فیصلہ کن انداز میں پوچھا،

''میں بھی تم کو جانتا نہیں ہوں، مگر پہچانتا ضرور ہوں''

''اوہ! میں کہیں پاگل نہ ہو جاؤں'' وہ گندی مکھی کی طرح میرے پیچھے پڑ گیا۔

میں بہت عاجز ہوا بات کو بدلنے کے لئے اور اس سے اپنے آپ کو چھڑانے کی غرض سے میں رستوران میں موجود ٹیلی ویژن کو دیکھنے لگا۔ اس میں خلا کے بارے میں کوئی فلم دکھائی جا رہی تھی

''تمہاری آنکھوں میں خوف کیوں ہے؟'' اس نے مجھے گھور کر پوچھا۔

''مجھے کسی قسم کا خوف نہیں ہے۔ میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں'' میں نے اسکو فوری طور جواب دیا، غصے اور نفرت کے ساتھ۔

''چھپاؤ مت، تمہیں خوف ہے، مجھے بھی ہے، ان لوگوں کو بھی ہے جو ہمارے دائیں بائیں بیٹھے ہیں۔ انسان اور خوف کا ازلی رشتہ ہے''۔

اس نے لمبی داستان شروع کی۔ میں چپ سادھے رہا اور پھر ٹیلی ویژن دیکھنے لگا۔ سکرین پر خلائی شٹل تیزی کے ساتھ خلا کو چیر کر کسی انجانی منزل کی طرف جا رہا تھا۔ شٹل کے اندر موجود سائنس دان خلا میں مشینوں کے ذریعے نہ جانے کیا کیا تلاش کر رہے تھے۔

''ہم ایک ہی لمحے میں زندہ بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں''۔ وہ ذرا

ٹھہر کر بہ آواز بلند مجھ سے کہنے لگا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اس سے میں مرعوب ہوجاؤنگا۔ میں نے اس کی طرف غصے سے دیکھا۔ واقعی میرا موڈ خراب تھا۔ سگرٹ جلا کر اور کھڑکی کی طرف منّہ کر کے میں یوں ہی چوک کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس وقت چوک بجلی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ لوگوں کا رش ابھی تھما نہیں تھا مگر نوجوانوں کی ٹولیاں دکان بڑھا کر کب کی نکل گئی تھیں۔

''خواہ مخواہ سوچوں میں ڈوب جاتے ہو'' اس نے مجھے چائے کی پیالی تھماتے ہوئے آہستہ سے کان میں کہا۔

''میری سوچ، میرے ہوش وحواس، میرا غوروفکر واقعی مجھے گہرائیوں میں ڈبو دیتے ہیں۔ میں تمہاری طرح کوئی مسخرا نہیں ہوں، جو چاہوں وہی کروں، جہاں جگہ ملے وہیں ڈیرہ ڈال دوں'' میں نے اسکو سخت لہجے میں جواب دیا۔

مجھے سب کچھ بدلا بدلا عجیب سا محسوس ہورہا تھا حالانکہ سارا رستوران بارونق اور سجا ہوا تھا، لوگ اپنی اپنی جگہ اپنی دنیا میں مست تھے، کچھ خواب دیکھ رہے تھے اور کچھ اپنے خوابوں کی پرورش کررہے تھے، لیکن میں ۔۔۔۔۔۔۔۔

''سوچ وہی ہے جو ذہن میں جگہ کرلے، اسکو کریدنا کیا؟'' وہ مجھے سمجھانے لگا۔

"oh,you shut up"

''دیکھ میرے بھائی ناراض مت ہو جا۔ذرا میری بات بھی سن لے، ہمارا ذہن اپنے گردونواح کے ماتحت ہے۔گردونواح انسان کے رویے کی طرح لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔معلوم نہیں تم سمجھ گئے'' اور اسکے بعد وہ بے اختیار ہنس پڑا جیسے وہ مجھے احمق سمجھ رہا تھا'

''باتونی، زبان دراز۔''

میں نے دبی زبان سے کہا۔ویسے پل پل اسکے لئے میری نفرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔اس نے میرا قیمتی وقت مجھ سے چھین لیا تھا۔کس چاؤ سے آج میں چوک میں نکلا تھا۔مگر کوچے میں ہی یہ گندی مکھی میرے پیچھے پڑ گئی۔نہ خود وہاں سے جاتا ہے اور نہ مجھے جانے دیتا ہے۔

'' ہم سب اس چوک کے مسافر ہیں۔اس چوک میں پہنچ کر صرف راستہ بدلتے ہیں۔اس کوچے سے نکلتے ہیں اور اس کوچے میں پہنچ جاتے ہیں یا اس کوچے سے نمودار ہوتے ہیں اور اس کوچے میں غائب ہو جاتے ہیں۔راستے آج بھی وہی ہیں۔کل بھی وہی تھے اور کل بھی وہی ہونگے۔ہاں مسافر بدلتے ہیں، مسافروں کے رویّے بدلتے ہیں، انکی سوچ بدلتی ہے، گردونواح بدلتا ہے، اس ٹیلی ویژن سکرین کی طرح۔''

میں نے ٹیلی ویژن کی طرف دیکھا، خلا سے متعلق فلم کب کی اختتام کو پہنچ چکی تھی۔اس پر کوئی قبائلی ناچ دکھایا جا رہا تھا۔کردار ناچنے کے ساتھ ساتھ تیز ہتھیاروں کا آزادانہ استعمال بھی کر رہے تھے، مجھے یہ پروگرام

نفرت آمیز اور وحشتناک لگا۔

''یہ بھی تمھارے گردونواح کا ایک حصہ ہے، معلوم نہیں تم یہ دیکھنا چاہتے بھی ہو''

''تمہارا ذہن الجھا ہوا ہے، سوچوں کو زنگ لگ گیا ہے'' میں نے چیخ کر کہا

''ہے نا میرا ذہن الجھا ہوا اور سوچوں کو زنگ لگا ہوا، تو تم سلجھاو نا!''

"oh shut up, please get lost.
I can no more bear you."

میں نے اتنی اونچی آواز میں یہ کہا کہ میں خود اپنے اس رویّے پر حیران ہوگیا۔ میں نے اپنے اردگرد نظر ڈالی کہ کوئی میری طرف دیکھ تو نہیں رہا ہے، مگر سب اپنی اپنی دنیا میں مست تھے، میں نے اسکی طرف کن انکھیوں سے دیکھا مگر وہ کب کا کرسی چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اس کے چلے جانے پر مجھے کچھ کھو جانے کا احساس ہوا۔ اور شدید خواہش ہوئی کہ میں اسکو پھر ایک بار دیکھ لوں، اسے جس نے میرا قیمتی وقت ضائع کیا تھا۔ میرے ذہن کو الجھا دیا تھا، مگر وہ معلوم نہیں کہاں سے نکل گیا تھا یا چھپ گیا تھا، میں خاموشی سے رستوران سے باہر آگیا۔ کافی وقت گزر چکا تھا، دکانیں بند ہوگئی تھیں، چوک خالی اور سنسان ہوگیا تھا۔ شاید وہ چوک میں سے دوڑ کے کسی اندھیرے

کوچے میں گھس کر چھپ گیا تھا۔ میں نے اسکو ان اندھیری گلیوں میں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی، تھک ہار کے میں چوک میں واپس آیا۔ چوک کے بیچوں بیچ کھڑا ہو کر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے۔ میں بے اختیار ہو کر چوک میں ایک طرف سر جھکا کے نہ جانے کیا سوچنے بیٹھ گیا۔ شاید بدلنے والا گردونواح اور بدلتے لمحوں کا بدلتا مزاج ڈھونڈنے۔۔۔!

یہی پری ہے

ڈاکٹر محمد شعبان نور پوری

﴿ڈاکٹر محمد شعبان نور پوری (نور پورہ اونتی پورہ) نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، رسالوں میں چھپتے ہیں۔ اب تک ان کی ایک تحقیقی اور تنقیدی کتاب جو پی۔ ایچ۔ ڈی کا تھیسس ہے، ''اسلوبیات'' کے عنوان سے چھپی ہے۔ وہ رومانوی اور تخیلی افسانے لکھتے ہیں۔ محمد شعبان اپنے افسانوں میں خواب اور حقیقت کو ملا کر سحر آلود ماحول کو ابھارتے ہیں۔ افسانہ ''یہے چھا پری'' (یہی پری ہے) سراسر تخیلی افسانہ ہے۔﴾

شام ہوگئی تھی اور میں ابھی وہیں جنگل میں تھا ایک گم گشتہ شخص کی طرح ایک ایک قدم اُٹھاتا رہا۔ کئی بار اپنے آپ سے پوچھا ''آخر میں کہاں جا رہا ہوں اور کیوں؟'' ہر بار جواب آیا ''نہ چلنے اور نہ رکنے میں'' اور یہ سوال پھر سوال ہی رہ جاتا۔ میں چلتا رہا۔ نہ پاوں کو رستے کا اتہ پتہ تھا اور نہ مجھے اپنے پاوں کی خبر۔ مگر میری بے چین نظر جنگل کے اندر تاریکیوں میں جانے کے لئے ترس رہی تھی۔

معلوم نہیں کیوں!

ہاں۔۔ ایک شدید احساس تھا کہ وہاں کچھ ہے!

مگر کیا؟ یہی سوال زمین کے اندر سے اُبھرتے پانی کی طرح بار بار نمودار ہوتا اور میرے وجود کو ہرن کی طرح بے قرار کرتا رہا۔

جنگل آج دلہن کی طرح دھلا دھلایا اور سجا سجایا تھا، جس درخت پر نظر جاتی، اس کی مسکراہٹ دیکھکر ہٹنے کا نام نہیں لیتی۔ لیکن دل میں دوسرے درختوں کو دیکھنے کی خواہش بھی ابھرتی۔ اسلئے میری نظریں جنگل میں آنکھ مچولی کھیلتی رہیں۔ اسی دوران جب دور اونچائی تک میری نظر گئی تو میں دیر تک ٹکٹکی لگا کے اسکو دیکھتا رہا۔ اور اندر ہی اندر سوچتا رہا؛

''یہ بھی ایک عجیب درخت ہے۔ ہر درخت خزان کی زد میں آجاتا ہے۔ اس کے پتے زرد ہو کر گر جاتے ہیں مگر خزان اور اس برفانی سردی میں بھی، جب تمام درخت ننگے ہو جاتے ہے، یہ بہار کی طرح سرسبز اور

شاداب ہے، یہ کیا راز ہے؟ یہ سماں پر اسرار تھا اور اس کی پر اثر کیفیات عجیب سی صورت اختیار کر کے ایک الگ ہی فضا میں پہنچاتیں، جس سے میرے تجسس میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا گیا اور اس پر اسرار ماحول میں میرا اضطراب بھی بڑھتا گیا اور جب بیچ میں خاموشی کو کاٹتی ہوئی کسی جنگلی جانور کی چیخ سنائی دیتی تو جنگل کی پوری فضا جیسے کھانے کو دوڑتی، دل کی دھڑکن خودبخود تیز ہو جاتی، بدن پسینے میں بہہ جاتا مگر میرے قدم اٹھتے گئے اور میں نظر آگے کی طرف رکھ کر چلتا گیا۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ایک طرف ہونٹوں پر مسکراہٹ اور دوسری طرف لرزہ دینے والا ڈر کیوں تھا؟

اچانک جب اسی اونچی دیوار کے قریب بجلی چمکی تو میرے قدم ایک دم رک گئے اور میں ہکّا بکا رہ گیا، کچھ نہ سمجھ سکا۔ ایک طرف یہ خوف ناک منظر تھا اور دوسری طرف میرا شوق بے اختیار، یہ دونوں جذبے دل و دماغ پر ایک ساتھ حاوی تھے اور میرے تذبذب کے باعث بنے تھے۔

ہے تو ہے کیا؟ اگر نہیں ہے تو پھر یہ کیا ہے؟ مختلف سوالات میری سوچ پر چھائے تھے۔ کسی نہ کسی طرح دل کو کڑا کر کے جب میں نے پھر اس طرف دیکھا تو دیکھتا ہوں کہ درخت کی شاخوں کے بیچ میں کچھ جگمگا رہا تھا۔

''میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں''

مگر میں تو ہوش میں ہوں۔ وہاں ایک سنہری چٹان جیسا کچھ ایستادہ ہے۔ مگر یہ کیا ہونا چاہیئے؟

''یہ کوئی مندر تو نہیں، جس میں سونے کی مورت ہے؟''

''مگر نہیں، وہاں کوئی مندر نہیں ہے''

''شاید پرانے زمانے میں کوئی تھا اور یہ اس کی ۔۔۔۔۔۔''

''یہیں تو نہیں رہ گئی ہوگی؟''

میں نے پھر قدم اٹھایا اور نظر اسی جگمگ کرتی سنہری مورت پر تھی اور میں کبھی ہونٹ کاٹتا، کبھی ماتھے کو سہلاتا اور کبھی بالوں پر ہاتھ پھیرتا، معاً مجھے خیال آیا کہ یہ کسی بھگوان کی مورت ہوگی؟

شری کرشنا ۔۔۔ رادھا؟

رام چندر ۔۔۔ سیتا؟

شیو شمبھو ۔۔۔ پاروتی؟

مہاتما بدھ ۔۔۔؟

کتنی تصویریں ذہن کے پردے پر ابھر آئیں مگر پہچانتے ہوئے بھی کسی ایک کو بھی پہچان نہ پایا۔ تصویریں ابھرنے سے پہلے ہی غائب ہو جاتیں۔ تصویر بننے لگتی، بڑھتی اور واضح ہونے لگتی لیکن پھر گھٹتی، گرتی اور غائب ہو جاتی۔ اسی دوران ہوا یہ کہ میری آنکھوں پر پردہ سا پڑ گیا۔ بائیں ہاتھ کو ماتھے پر رکھکر جب میں پھر دیکھنے لگا تو میں سُن ہو کے رہ گیا، آنکھیں ساکت ہوگئیں، ہونٹوں پر آیا'

''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، مورتی ابھی ابھی سنہری تھی ۔۔ اب

چاندی جیسی چمک رہی تھی۔۔۔۔'' ماتھے سے ہاتھ آہستہ آہستہ ہٹا کر میں نے ایک لمبی سانس لی اور سر نیچے کر کے قدم آگے بڑھانے شروع کئے۔

''ہنہ!'' میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ''یہ پری تو نہیں، جو روپ بدلتی ہے''۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے جیسے میرے ارد گرد سب کچھ خاموش، بے صدا ہو گیا اور میں بیچ میں کھڑا، گُم گشتہ۔۔۔ذرا پیر جمائے، سر اونچا کیا اور میں نے پھر کن انکھیوں سے اسکو دیکھا اور سوچوں میں ڈوب گیا۔

''وہیں پر جو ابھی سنہری لباس زیب تن کئے تھی اور اب زرق برق روپہلی بن گئی، دیکھو، کس طرح اپنے لباس کو لہرا رہی ہے''۔ اس کی مست جوانی دیکھکر میرے دل میں شہد گھل گیا، انگ انگ میں حرارت دوڑ گئی، دونوں بازوں سمیٹ کر میں پھر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ مگر یہ کیا، یہ حرکت نہیں کرتی، ایک جگہ پر کھڑی اپنے لباس کو لہرا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے میں نے سوچا، کیوں نہ میں وہیں جا کر اسے دیکھو۔

''اوہو، کیا تمہیں اپنی جان عزیز نہیں؟ یہ پری زاد ہے۔'' ''پھر کیا ہوا؟ آخر مرنا ہی تو ہے، آج ہی سہی، یہیں پر رہنا ہے کیا''۔۔۔؟

''پری کو دیکھ تو لوں گا، کیا صورت پائی ہے اس پری نے! جنت کی حوریں بھی ایسی ہی ہوتی ہونگی! ٹھیک ہے، 'ہاں' میں ضرور جاؤںگا اور اسکو زور سے سینے سے لگاونگا''

میرے سینے میں دباؤ محسوس ہوا اور آگے کا راستہ نہ ملا۔ آخر میں نے مٹھّیاں بھینچ کر تیز دوڑنا شروع کیا، ننگے پاؤں کھردرے پتھروں میں سے دوڑتا ہوا میں دامن کوہ تک پہنچ گیا۔ سارا جسم پسینے میں تر ہو گیا، قمیض کے گریبان کے بٹن کھول دئے۔ دم سنبھالا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھکر اوپر چڑھنا شروع کیا۔

''شی، شہ شہ'' ۔۔۔ چاروں طرف سے یہیں آوازیں آرہی تھیں، پیچھے مڑ کر دیکھا سورج ڈوب گیا تھا اور آسمان پر شفق پھیل گئی تھی ادھر پہاڑ کی چوٹی پر بھی دھوپ کا آتشیں ٹکڑا موجود تھا۔ دن ڈوبنے کے ساتھ ہی اب میری ٹانگوں کی سکت بھی ختم ہوتی رہی، میں چکرا رہا تھا، سانس اسقدر پھول گئی تھی کہ منہ بند نہیں رکھ سکتا تھا، دل کی دھک دھک تیز ہوتی گئی، گلا سوکھ گیا اور خیالات میں طوفان تھا۔

''ہوگی؟ نہیں ہوگی ۔۔۔ اگر ہوگی تو کیسی ہوگی؟ اگر نہیں ہوگی تو پھر کیا ہوگا''؟ ۔۔۔۔

پھر جب کولھوں پر ہاتھ رکھکر میں نے اوپر نظر دوڑائی، وہاں وہ بڑا، اونچا دیودار تھا جس کے قریب ہی مجھے وہ پری نظر آئی تھی، اب اور اوپر جانے کا راستہ نہیں تھا تو میں نے پتھروں کو پکڑ پکڑ کر آگے جانا شروع کیا۔ پاؤں لرزنے لگے اور ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ جوں ہی میں نے سر اوپر کر کے دیکھا تو ۔۔۔۔

''یہاں یہ آبشار ہے۔اوپر سے پانی آتا ہے اور نیچے شور مچاتے ہوئے
بہہ جاتا ہے۔یہی پری ہے۔۔۔''؟اسی کے ساتھ دل زور سے دھڑکا
اور ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑگئی اور میں پہاڑ سے لڑھک گیا۔زخموں سے
خون بہہ رہا تھا، درد کی شدت سے آنسو سوکھ گئے اور میں بے ہوش ہوگیا۔

مطبوعہ شعری مجموعے

اردو

عروس تمنا

نایافت

لاحرف

شاخ زعفران

وادئ امکاں

خواب رواں

شہر گماں

کشمیری

نارس اتھ وا

یتھ میانہِ جویہ

آواز وائژی نو

inted at Rafiq Printing Press
ai Sarak, Habba Kadal, Sgr. Ph. 2456111